ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲ر نومبر ۱۹۹۲ء

☆ انقلاب نبوی کی تکمیل ہجرت پر ہوئی یا فتح مکہ کے بعد؟
☆ پاکستانی سیاست میں خفیہ ایجنسیوں کا کردار!
☆ بلا سود بینکاری کا متبادل نظام---- ایک تحقیقی جائزہ

بارود اور برادہ

ہمارے ایک کرم فرما قریب ہی مورچہ بند ہیں اور اہداف ان کے دو ہیں' اولاً دعوت رجوع الی القرآن کے نتیجے میں اسلام کے انقلابی فکر سے متاثر ہو کر حرکت میں آنے اور تنظیم اسلامی کے قافلے میں شریک ہو جانے والے لوگ اور ثانیاً خود وہ منطق جو مطالبات دین سے آگہی کے بعد ہر باشعور مسلمان کے قلب و ذہن میں ایک کشمکش برپا کر دیتی ہے۔ اپنے پہلے ہدف میں وہ گاہے گاہے کامیابی حاصل کرتے رہتے ہیں اور انہیں "وہ مارا" کی نوید جانفزا میسر آجاتی ہے کیونکہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے کے بعد آدمی زادہ کہ طرفہ تماشا است' اپنے نفس سے' اپنے ماحول سے اور اس معاشرے سے جو مکھی لڑائی لڑتا ذرا تکان محسوس کرنے لگے تو ہمارے کرم فرما کی جانب سے اس کے کانوں میں میٹھی اور خواب آور لوریوں کے قطرے ٹپکائے جاتے ہیں جن میں سے بعض درد الفت کی بے چینی میں سکون کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ البتہ دوسرے مشن میں وہ اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے کہ واسطہ ان کا اس منطق سے ہے جس کے صغریٰ کبریٰ کے مقابلے میں ان کے بزعم خود دلائل' لطائف الحیل سے زیادہ سنجیدہ توجہ کے مستحق نہیں ہوتے' نظر بندی کے کمال کے باعث بہت بھاری بھرکم نظر آئیں تب بھی ان کا تانا بانا ایک بھی ضرب کلیمی کی تاب نہیں لا سکتا اور تار عنکبوت کی طرح بکھر کر رہ جاتا ہے۔

موقر روزنامہ "نوائے وقت" کے ذریعے ڈاکٹر اسرار احمد کی انقلابی دعوت ایک بڑے حلقے میں پہنچنے لگی تو وہ بھی کان پر دھر کر قلم نکلے اور ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی واویلا شروع کر دیا لیکن ایک محکم اساس پر کھڑی کی جانے والی قرآنی دلائل و براہین سے مرصع عمارت کو اڑانے کے لئے جو بارود انہوں نے استعمال کیا' وہ لکڑی کا برادہ نکلا۔ یہ برادہ سلگ کر رہ گیا تو ان کے دل سے آہوں کا دھواں تو ضرور اٹھا ہو گا اور برادہ بھی اپنی جان سے گیا' الحمدللہ کہ راست فکر کے اس شجرۂ طیبہ کی کوئی ایک شاخ بھی نہیں مرجھائی جس کی جڑ پر انہوں نے اپنے تئیں بھرپور وار کیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی زیر نظر شمارے کے حاصل مضمون میں پڑھئے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اپنے قلم سے ہے لیکن گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والی اس کی پہلی قسط کو دوبارہ پڑھ کر اسے شروع کیجئے تو "غلطی ہائے مضامین" کی نشاندہی کرنے والے کی اپنی پہاڑ جیسی غلطی اس تل کی اوٹ سے نکل کر سامنے آجائے گی جسے اس نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی تھی۔○○

قیمت ۵ر روپے

خطوط آپ کے

جناب اقتدار احمد صاحب!
السلام علیکم و رحمہ اللہ و برکاتہ'
مزاج عالیہ!

آج سہ پہر پرچہ "ندائے خلافت" لے کر گھر آیا دو مضامین راستے میں ہی پڑھ آیا تھا بقیہ کے اختتام پر عرض ہے کہ احقر کے نام اب (۵) پرچے کردیں اب تک تو (۳) تین ہی آتے ہیں؟ ہاں! قلمی تعاون اس سے آگے چلے گا ان شاء اللہ۔ آپ کمرہمت کس رکھئے۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں یہ پرچہ میرے دل کی آواز ہے کیوں نہ ہو اس شمارہ (جلد ا شمارہ ۳۸) کے تمام مضامین اس قدر پیارے ہیں کہ سب کی کاپیاں تقسیم کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ مگر جناب یہ آپ غائب کیوں ہوجاتے ہیں؟ اک "افتتاحیہ" سے حاضری تو مکمل نہیں ہوتی۔ میرے دوست صدر معلم مرزا رفیق صاحب اب "ندائے خلافت" کے بڑے عاشق بن گئے ہیں اور اک چودھری اکرم صاحب ممبر ضلع کونسل تو دل و جان سے فدا ہیں انہیں باقاعدگی سے پڑھاتا ہوں۔ ہاں یہ بھی تو اس کی شدت سے طلب رکھتے ہیں۔ "ندائے خلافت" کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے۔

ہم سب کی طرف سے اعلان ہے کہ اس وقت =/۵ روپے کوئی زیادہ قیمت نہیں "ندائے خلافت" میں جو کچھ آرہا ہے اسے دیکھ کر تو یہ بدل اشتراک حقیر لگتا ہے۔ ان شاء اللہ میں اپنا مزید بدل اشتراک سالانہ اجتماع پر یا اطلاع پر ادا کروں گا۔

جناب یہ حبیب جالب کے بابت سب کچھ حقیقت لکھ کر "حقیقت" آپ ہی کہہ سکتے ہیں مبارک ہو۔ اک مشورہ ہے حافظ عاکف سعید بھائی سے کہہ دیں وہ "الہدیٰ" پر اسی طرز سے کام جاری رکھیں ماشاء اللہ باپ کی کیسٹس موجود تو بیٹے کا یہ قیمتی و مثالی لیکن مختصر و خوبصورت تشریح "سونے پہ سہاگہ" والی بات ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

سب کو عموماً" اور عاکف بھائی کو خصوصاً"
سلام عقیدت

والسلام احقر العباد
قاری شبیر احمد' سہار میرپور آزاد کشمیر

۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۳ء

اخی فی الدین جناب نعمت اللہ خان صاحب دامت اقبالکم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ'
امیر جماعت اسلامی' کراچی!

ہمارا شاید کبھی بالمشافہ تعارف تو نہیں ہوا لیکن میں تین رشتوں سے آپ سے بخوبی واقف ہوں۔ پہلا رشتہ تو انما المومنین اخوۃ کا ہے۔ دوسرا رشتہ یہ ہے کہ آپ اس وقت اس جماعت کے امیر ہیں جس سے ۴۶ء سے ۸۵ء تک میرا بھی تعلق رہا ہے اور جس کی بدولت مجھے شعوری مسلم بننے کی توفیق ملی اور تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جماعت سے میرا قابل لحاظ حد تک فعال و متحرک نوعیت کا تعلق رہا ہے اور تیسرا رشتہ یہ ہے کہ ہم اس ملک کے ہم وطن ہیں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور جس کا استحکام ہی نہیں بلکہ بقا کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہاں محض ہاتھوں کی تبدیلی نہیں بلکہ حقیقی طور پر اسلامی عدل و قسط پر مبنی نظام قائم ہو جو ایک اسلامی' اصولی اور انقلابی جدوجہد کا متقاضی ہے ---- میرا حسن ظن ہے کہ انہی رشتوں کی بنیاد پر آپ خاکسار سے غائبانہ طور پر بھی واقف ہوں گے۔

مقاصد اور اہداف کے اس اشتراک کے باوجود طریقہ کار کے اختلاف کے باعث ہمارے مابین ایک نوع کا بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اس بعد و فصل کو وصل میں تبدیل کرنے کی کیا کوئی سبیل ہوسکتی ہے! اس پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ اسی میں ہماری اخروی و دنیوی فلاح ہے اور اسی میں اس ملک کی سلامتی کا بھی بڑی حد تک انحصار ہے۔

"الدین النصیحہ (دین تو خیر خواہی کا نام ہے)" کے ارشاد نبوی علیٰ صاحب الصلوۃ والسلام کے مطابق ان سطور کا یہ عاجز و حقیر راقم پورے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ حسب ذیل معروضات پیش خدمت کرتا ہے۔

(ا) تدبیر کی غلطی کے نتائج غلط ہی نکل سکتے ہیں چاہے غلطی اخلاص کے ساتھ ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔

(ب) انقلابی منہج کو چھوڑ کر (جو دین کے مجموعی مزاج و منہاج کے مطابق تاسیس کے وقت اختیار کیا گیا تھا) انتخابی سیاست کی راہ اختیار کرکے جو کچھ پایا اور جو کچھ کھویا! کیا اب بھی اس کے جائزے اور احتساب کا وقت نہیں آیا!

(ج) اس وقت جماعت جس بحران سے دوچار ہے کیا وہ اس خطرے کی نشان دہی نہیں کررہا کہ جماعت اپنا رہا سہا تشخص بھی اعیاذ باللہ گم نہ کردے۔ (بہت بڑا حصہ تو جماعت کے آئی جے آئی میں شمولیت کے وقت گم کیا جاچکا تھا)۔

(د) جماعت کے نہایت قابل احترام اکابر اب جماعت میں رہتے ہوئے مبینہ طور پر گندے کپڑے برسربازار دھو رہے ہیں' کیا اس سے جماعت کی رہی سہی نیک نامی اور عمدہ ساکھ کو جو خطرہ درپیش ہے اس کے تدارک کی کوئی سبیل نکالی جاسکتی ہے!!

آج وقت کا تقاضا ہے کہ ان مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر ہو اور کوئی راہ نکالنے کی ہر وہ سعی کی جائے جو انسانی امکان میں ہو۔ اس ضمن میں "میثاق" اکتوبر کا شمارہ اس درخواست کے ساتھ ارسال خدمت ہے کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ حصہ اس کے مطالعہ کے لئے نکالئے۔ ضروری نہیں کہ آپ اس سے اتفاق ہی کریں لیکن توقع ہے کہ اس پرچے کے مشمولات کو آپ فکر انگیز ضرور پائیں گے۔

والسلام مع الاکرام
خاکسار جمیل الرحمٰن

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۴۰
۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء

○

مدیر
اقتدار احمد
معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
مرکزی دفتر: ۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
مقامِ اشاعت
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون:- ۸۵۶۰۰۳

○

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ: -/۵ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) -/۲۰۰ روپے

○

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۴۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۵ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۲۰ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۴ " "

افتتاحیہ

ہمارا نیو پولیٹیکل آرڈر

شائستگی تو پاکستان کی داخلی سیاست میں کبھی بھی اذن باریابی نہ پا سکی لیکن پچھلے چند ماہ سے اس کے تیور جارحیت میں ہر حد کو پھلانگ جانے کے ہیں اور اس معاملے میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے ارادے یکساں خطرناک نظر آتے رہے ہیں۔ حکمراں طبقے کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی ہے کیونکہ اس کے کھونٹے تا حال مضبوط ہیں اور اسے سیاہ و سفید دونوں طرح کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا طویل تجربہ بھی ہے جبکہ حکومت مخالف عناصر کو اپنی پشت دیوار سے لگانے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ وہ خواہی نخواہی اور تیاری کر کے یا بغیر پوری تیاری کے اپنے مد مقابل سے اب آخری لڑائی کرنے کا فیصلہ نہ کریں تو ان کا ناطقہ بند کر دیا جائے گا بلکہ انہیں فنا کے گھاٹ اتار کے چھوڑا جائے گا۔ سیاسی مخالفت عریاں دشمنی کا روپ دھار چکی ہے اور محاذ آرائی بیانات سے بڑھ کر عملی اقدامات کے مرحلہ میں داخل ہوا چاہتی ہے۔

ایک طرف نواز شریف حکومت اپنے آپ کو فرشتوں کی جماعت سے کمتر درجہ دینے پر آمادہ نہیں اور مخالفین کو طائفہ شیاطین قرار دیتی ہے تو دوسری طرف مخالف جماعتیں اپنے اپنے انداز میں ملک و قوم کے حق میں ظاہر ہونے والی ہر خرابی کی ذمہ داری حکومت پر ڈال رہی ہیں خواہ وہ آفات سماوی ہی کیوں نہ ہوں۔ سیاسی کشمکش اور معمول کی محاذ آرائی نے گزشتہ ۴۵ برسوں میں ایسی خطرناک نوعیت اختیار نہیں کی تھی جو اب بالکل سامنے کی بات ہے اور اس پیشینگوئی کے لئے ستارہ شناسی کی قطعاً" حاجت نہیں رہی کہ پاکستان جیسی نظریاتی ریاست اس بدتمیزی، ہلڑ بازی اور دھول دھپے کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی اور یہ سلسلہ جاری رہا ----- بلکہ بڑھا جیسا کہ نظر آرہا ہے---- تو اس کے ہولناک نتائج ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ دنوں میں نہیں تو ہفتوں میں اور زیادہ سے زیادہ چند مہینوں میں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا اور جو کچھ ہوتا محسوس کیا جا سکتا ہے، وہ ملک و قوم کے حق میں نیک شگون کسی بھی صورت میں نہ ہوگا۔ الٰہی خیر میرے آشیاں کی۔

صورت حالات نے اس قدر تشویشناک شکل کیوں اختیار کر لی ہے؟۔ یہ سوال اگرچہ اہم ہے لیکن مشکل نہیں کیونکہ جواب ہر باخبر و با شعور کو معلوم ہے خواہ وہ زبان پر لائے یا پاس مصلحت میں چپ سادھے رکھے۔ آزادی صحافت نے جو کچھ دنوں سے حکمرانوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، کم سے کم یہ تو کیا ہے کہ محلاتی سازشوں کو بھی بے نقاب کر دیا اور ہمارے ملک کے ساتھ خاص مثلث اقتدار کے خفیہ گوشوں تک کو عام لوگوں کے لئے بڑی حد تک کھول کر رکھ دیا چنانچہ اب کون ہے جو بلا تامل اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکے کہ خرابی کی جڑ ایوان صدر میں ہے، وزیراعظم ہاؤس میں ہے یا جی ایچ کیو میں!۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ عوام جو ہماری موجودہ جمہوریت میں حاکمیت کی تہمت اٹھاتے ہیں، محض بے بس ہیں اور ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم پر مجبور۔ ملک و قوم کا حال اور مستقبل چند ہاتھوں کا اسیر اور چند مٹھیوں میں بند ہو کر رہ گیا ہے اور جمہور نتائج بد کو بھگتنے کے لئے ہیں یا بد ترین حالات کا سامنا کرنا ان کے لئے مقدر ہو گیا ہے جو جب چاہیں گے برق و رعد کی طرح کوندیں گے اور ان کی امیدوں کے گھروندوں کو جلا کر خاکستر بنا جائیں گے۔

پی ڈی اے کی طرف سے احتجاجی مہم کا آغاز جس انداز میں ہوا ہے اس کے بارے میں اگرچہ دوسرے چند مقامات سے خیریت کی خبریں ملیں لیکن لاہور میں بسم اللہ ہی غلط ہو گئی اور یہ وبا دوسرے شہروں میں بھی پھیلنے کا امکان موجودہ ہے۔ ہم بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس طرز عمل کی مذمت کرتے ہیں

(باقی صفحہ ۷ پر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الہدیٰ

سورۃ البقرہ

(آیت ۱۳۷ ‘ ۱۳۸)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

سو اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ پھر جائیں تو پھر وہی ضد میں مبتلا ہیں‘

(کہ اے مسلمانو‘ جس طرح تم حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہو اور ان کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتے ‘ اگر یہ اہل کتاب بھی اسی طور پر اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائیں اور جس طرح یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اسی طرح محمد صلی علیہ وسلم کو بھی اللہ کا رسول تسلیم کریں تو بلاشبہ یہ لوگ راہ ہدایت پر ہوں گے ۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو جان لو کہ پھر یہ محض ان کی ضد ہے اور ہٹ دھرمی ہے جس کے باعث وہ درپئے مخالف ہیں ‘ قبول حق سے انہیں کوئی سروکار نہیں!)

پس ان کے مقابلے میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا ‘ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ○

(کہ اے اہل ایمان‘ یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور سازشوں سے ہرگز پریشان نہ ہونا ‘ ان سب کے مقابلے میں ایک اللہ تمہارے لئے کافی ہے جو سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے ۔

کیا ڈر اگر ساری خدائی ہے مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!)

ہم نے تو قبول کرلیا اللہ کا رنگ‘ اور کون بہتر ہوگا اللہ سے رنگ کے اعتبار سے ‘ اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں○

کہ ہم کسی بپتسمہ کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ نصاریٰ کے ہاں دستور تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا یا کوئی ان کے دین میں داخل ہوتا تو اسے پاک کرنے کے لئے زرد رنگ میں غوطہ دیتے ‘ بلکہ ہم نے تو اللہ کے رنگ یعنی دین حق کو اختیار کیا ہے کہ یہی وہ سچا دین ہے جو انسان کو ہر نوع کی معنوی و ظاہری ناپاکی سے نجات دیتا اور اس کے قلب و ذہن کو پاکیزگی بخشتا ہے!)

جوامع الکلم

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے‘

(خود غرضی ایک نہایت ناپسندیدہ وصف ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان کی رو سے ایمان اور خود غرضی جمع نہیں ہوسکتے ۔ ایمانی اخوت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا اور باعث خیر سمجھتا ہو اپنے بھائیوں کے لئے بھی وہی شے پسند کرے اور اس خیر میں انہیں بھی شریک کرے ۔ گویا جس بات سے وہ خود کو تولتا ہو دوسروں کو بھی اسی سے تولے۔ اس نے اگر ایمان و اسلام کا راستہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اختیار کیا ہے تو اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بھائی بندوں کو بھی راہ ہدایت پر لانے اور ان کا حقیقی مستقبل یعنی آخرت سنوارنے کی بھرپور کوشش کرے!!)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم بروایت حضرت انسؓ)

پاکستانی سیاست میں خفیہ ایجنسیوں کا کردار

ایوب خان سے نواز شریف تک

مشرقی پاکستان کی علیحدگی' سندھو دیش کے نعرے' ایم کیو ایم کی تشکیل —— یہ سب کس کے کارنامے ہیں؟

خفیہ ایجنسیوں نے ہی افغان مجاہدین میں بھی انتشار پیدا کیا!

عبدالکریم عابد

پاکستانی سیاست میں آج ہر طرف جو بگاڑ نظر آتا ہے وہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کی مہربانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پچیس سال سے قومی سیاست کو نہ سیاستدان چلاتے رہے نہ جرنیل حضرات' بلکہ اس سیاست کی باگ ڈور کار خاص کے محکموں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ روس میں کے جی بی اور امریکہ کی سی آئی اے بھی بڑے طاقتور ادارے تھے اور انہوں نے عالمی حالات اور واقعات کے الٹ پھیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔ بھارتی ایجنسی " را" اور اسرائیل کی " موساد" کی سرگرمیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے لیکن کے جی بی' سی آئی اے " را" موساد پر سیاستدانوں کی مضبوط گرفت رہی۔ ان خفیہ ایجنسیوں کی نظر نہ آنے والی حکومت کے اصل حکمراں ان کی حکومتوں کے سربراہ اور پارٹی لیڈر تھے جبکہ پاکستان میں پارٹی اور حکومت دونوں کو چلانے والے خفیہ ایجنسیوں کے کرتا دھرتا تھے۔

ایوب خاں کے دور میں ان ایجنسیوں کا مسئلہ یہ تھا کہ جمہوریت کے لئے کوئی موثر اور منظم سیاسی پلیٹ فارم نہ بن سکے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی " امیدوار" بننے کے بعد ایوب خاں سخت مشکل میں پڑ گئے تھے کیونکہ مادر ملت کے پیچھے سارے لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن فیصلہ بنیادی جمہورتیوں کے ارکان نے کرنا تھا۔ زیادہ خدشہ مشرقی پاکستان کی یونین کمیٹیوں اور یونین کونسلوں سے تھا۔ اس خدشہ سے نبٹنے کے لئے بھاشانی نیپ کو خریدا گیا۔ بھاشانی اور مسیح الدین در پردہ ایوب خاں سے مل گئے تھے اور یہ کارنامہ خفیہ ایجنسیوں نے انجام دیا تھا لیکن ان ایجنسیوں کی حیثیت ہمیشہ آستین کے سانپوں کی ہوتی ہے اور بہت جلد ایجنسیوں نے ایوب خاں کے خلاف کام شروع کردیا۔ اس میں امریکی سی آئی اے بھی شامل تھی کیونکہ ایوب خاں نے کہہ دیا تھا کہ امریکہ ہمارا دوست ہے آقا نہیں۔ وہ پاکستان کو ایک حد تک معاشی ترقی دینے کے بعد سوچنے لگے تھے کہ مزید ترقی کے لئے ہمیں امریکی منصوبہ بندی کی بجائے اپنی منصوبہ بندی کرنی ہوگی' بنیادی اور بھاری صنعتوں کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی۔ انہوں نے ایک "قومی بورژوا" کا عنصر بھی پیدا کر لیا تھا وہ ان کے ساتھ تھا مگر امریکہ پاکستان کی اقتصادی ترقی کو ایک خاص حد پر روکنا چاہتا تھا۔ ایوب خاں اس سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

اس تضاد کے ساتھ ایک اور تضاد یہ تھا کہ بیوروکریسی کو نئے صنعتی طبقہ کا ابھار پسند نہیں تھا جو ایوب خاں کے ارد گرد تھے۔ بیوروکریسی کا خیال تھا کہ اس طبقہ پر ضرب لگانی چاہیے اس کے لئے انہیں سوشلزم کا نسخہ کار آمد معلوم ہوا اور اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا' ایوب خاں کو نیشنلائزیشن پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہ ناکام رہی' اس کے بعد انٹیلی جینس ایجنسیوں نے مزدور یونینوں کو فنڈز فراہم کئے' جلاؤ گھیراؤ کی سرگرمیوں کے لئے تحفظ دیا اور ایسے ایسے واقعات ہونے لگے کہ سرمایہ دار کانپ گئے۔ احمد فوڈ انڈسٹریز کے مالک کو مزدوروں نے جلتے کڑھاؤ میں پھینک دیا' کارخانوں پر قبضے کئے گئے' مالکوں اور مینیجروں نے اپنے ہی کارخانوں سے روپوشی اختیار کی۔ اس ہڑبونگ میں کمیونسٹوں کی پرانی ٹریڈ یونینیں اور ٹریڈ یونین لیڈر شامل نہیں تھے۔ ایک دم سے نئے لوگ نئے ناموں کے ساتھ سامنے آگئے تھے اور ان کا ملک کی مزدور تحریک سے کبھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پرانے ٹریڈ یونین لیڈر انہیں بے چارگی کے عالم میں دیکھتے رہے۔

اسی دور میں انٹیلی جینس ایجنسیوں نے پروجائنا لیفٹ اور پیپلزپارٹی کو آگے بڑھایا۔ بھٹو بذات خود بھی غیر معمولی ذہانت' قابلیت اور صلاحیت کے مالک تھے لیکن ان کا عروج نہیں ہوسکتا تھا اگر فوج' بیوروکریسی اور انٹیلی جینس اداروں سے ان کی ملی بھگت نہ ہوتی۔ ایوب خاں کے خلاف "عوامی تحریک" ایسی نہیں تھی کہ ایوب خاں بھاگ جاتے۔ مشرقی پاکستان میں تو یہ تحریک تھی ہی نہیں صبور خاں' منعم خاں' فضل حق چودھری اور دوسرے کنونشن لیگی لیڈروں نے صوبہ کو قابو کر رکھا تھا۔ پھر مغربی پاکستان میں مخالف ایوب تحریک کے نعرے بھی مشرقی پاکستان کے نقطہ نظر سے فضول تھے مثلاً معاہدہ تاشقند کی

مخالفت، کشمیر پر نعرہ بازی، بھارت کو کچل دو کے عنوان سے شور و شر، سوشلزم کی ہڑبونگ ان سب باتوں سے مشرقی پاکستان کے عوام اور رہنماؤں دونوں کو ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی ۔ بھٹو کے مقابلے میں ان کی ہمدردی ایوب خاں کے ساتھ تھی۔ کونشن لیگ کے تحت ایک ایسا خوش حال متوسط طبقہ مشرقی پاکستان میں وجود میں آگیا تھا جو ایوب خان سے خوش تھا۔ جو لوگ جمہوریت یا صوبائی خود مختاری کی مانگ رکھتے تھے وہ بھی اس کی بھٹو سے کوئی توقع نہیں رکھتے تھے اس لئے مغربی پاکستان میں مخالف ایوب ایجی ٹیشن کا مشرقی پاکستان میں کوئی اثر نہیں تھا یہ ایجی ٹیشن مغربی پاکستان میں بھی بہت محدود تھا۔ زیادہ گڑبڑ پنجاب کے کچھ شہروں اور کراچی کے مخفی علاقوں میں تھی ۔ ایوب خاں کا رعب داب قائم تھا اس وقت تک بھٹو نے بھی پیپلزپارٹی نہیں بنائی تھی اور وہ زیادہ وقت اندرون سندھ میں گزارا کرتے تھے یا بیرون ملک رہتے تھے ۔ بھٹو کی مقبولیت کا دور ایوب خاں کے ہٹنے کے بعد آیا ۔

ایوب خاں کی کوئی بنیاد نہیں رہی تھی ، فوج کے جنرلوں میں یحیٰی خان ان کی جگہ لینے کا مصمم ارادہ کرچکے تھے اور سول وملٹری دونوں ایجنسیاں ایوب خاں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں۔ ان حالات میں ایوب خاں چل نہیں سکتے تھے اور انہیں رخصت ہونا پڑا لیکن ان کی رخصتی عوامی طاقت کا نتیجہ نہیں تھی، پس پردہ کی سازشوں کا نتیجہ تھی ۔ اگر عوامی طاقت ایوب خاں کو ہٹا سکتی تو مادر ملت کی انتخابی مہم کے دوران ہی ایوب خاں کو ہٹ جانا چاہیے تھا لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ فوجی اور سول بیورو کریسی اور خفیہ ایجنسیوں کی ایوب خاں کو اعانت حاصل تھی اور ان کے مقابلے میں بے چارے عوام کی طاقت کسی گنتی میں نہیں تھی ۔

ایوب خاں کے بعد یحیٰی خاں کے دور میں بھٹو اور خفیہ ایجنسیوں کی ساز باز قائم رہی۔ یحیٰی کا خیال تھا کہ مجیب سے سمجھوتہ کر کے اسے وزیراعظم بنائیں گے اور خود صدر بن جائینگے ۔ ہر آئین میں صدر کے کچھ خصوصی اختیارات ہنگامی حالات کے لئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور اختیارات مجیب یحیٰی خاں کو دینے کے تیار تھا لیکن ہماری بیورو کریسی اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کو یہ انتظام پسند نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کو جب تک ممکن ہو ایک کالونی بنا کر رکھیں اور جب وہ کالونی نہ رہ سکے تو الگ ہوجائے۔ یہ بات کہ پاکستان کے مرکزی اقتدار میں مشرقی پاکستان کو برابر کا حصہ دار مانا جائے، سول و فوجی بیورو کریسی تسلیم نہیں کرسکتی تھی حالانکہ ملک کی جمہوری تحریک کو توڑنے کے لئے ایوب خاں کے زمانے میں چھ نکات انٹیلی جینس ایجنسیوں نے ہی مجیب کو فراہم کئے تھے لیکن مجیب کو وہ وزیراعظم بنانے میں خدشہ محسوس کرتے تھے کہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں اور جمہوری عناصر سے وہ کوئی اتحاد قائم کر لے گا اور ہمیں پیچھے دھکیل دے گا اس لئے مجیب یحیٰی سمجھوتہ نہیں ہونے دیا گیا۔

جب بھٹو نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے پر اس اجلاس میں شرکت کرنے والوں کو ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دی تو اس دھمکی کی پشت پر فوجی و سول بیورو کریسی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طاقت تھی۔ اس طاقت کے سامنے یحیٰی خان نے ہتھیار رکھ دئے، قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا اور جو بھٹو چاہتا تھا وہ کیاگیا۔ اس کے لئے بھٹو صاحب کو نائب وزیراعظم بھی بنایا گیا ۔۷۷ء کے الیکشن میں انٹیلی جینس ایجنسیوں کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے نظریہ پاکستان کے حامیوں اور اسلامی عناصر کو متحد نہیں ہونے دیا۔ ممتاز دولتانہ کے پیچھے خان قیوم کو لگا دیا گیا۔ ان کی قیوم لیگ سارے پنجاب میں ڈھول پیٹتی رہی کہ دولتانہ نے ولی خاں، جی ایم سید اور مجیب سے خفیہ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ اس طرح ہر حلقے میں لیگی امید وار آمنے سامنے تھے۔ اس پر ہی بس نہیں تھا، ایک جمعیت علمائے پاکستان بھی پیدا کرلی گئی۔

مولانا نورانی سمجھدار آدمی تھے وہ مولانا شفیع اوکاڑوی سے لے کر سہگل تک سب لوگوں کو خوب سمجھتے تھے کہ ان کے کھیل کے پیچھے کون ہے۔ انہوں نے اس امر کی مخلصانہ کوشش کی کہ تمام اسلامی عناصر کا اتحاد ہوجائے اور یہ عناصر دونوں مسلم لیگوں کو بھی اپنے اتحاد میں سمیٹ لیں اس ہی اتحاد کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ جماعت اسلامی سے خائف تھے اور سمجھوتہ چاہتے تھے لیکن انٹیلی جینس ایجنسیوں کے آدمی ہر ہر اسلامی جماعت کے رہنماؤں کے پاس جا کر ان کے کان میں پھونکتے تھے کہ آپ کی زبردست عوامی حمایت ہے اور الیکشن بس آپ ہی جیت رہے ہیں۔ یہ کاروبار اس لئے تھا کہ یحیٰی خاں کے مقابلے میں کوئی بڑی متحدہ طاقت نہ پیدا ہونے پائے لیکن تقسیم کرو کی اس پالیسی نے عملاً بھٹو کو ایک بڑی طاقت بنا دیا۔ افتراق کا شکار جماعتیں وہ فضا نہیں پیدا کر سکیں جو اتحاد پیدا کر سکتی تھی اور اس افتراق کی وجہ سے ہی وہ ۳۶ فی صد ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔ یہ ووٹ بھی انہیں بیشتر پنجاب ہی میں ملے۔ اگر دولتانہ کی کونسل لیگ ، قیوم لیگ، جماعت اسلامی، جمیعت العلمائے پاکستان اور جمیعت العلمائے اسلام ۷۰ء میں اسلامی جمہوری اتحاد بنا کر الیکشن لڑتے تو فضا اور ہوتی۔ اس اتحاد کو مشرقی پاکستان میں بھی کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہو سکی تھی لیکن پاکستان میں ان جماعتوں کے انتشار کے بعد بھٹو کا خطرہ مشرقی پاکستان کے سامنے آیا اور اس خطرہ کی وجہ سے وہاں عوامی لیگ ایک طاقت بن گئی جس طرح یہاں عوامی لیگ کے خوف نے پیپلزپارٹی کو طاقت ور بنایا۔ یحیٰی خاں کے دور میں بھٹو اور پیپلزپارٹی تو مشرقی پاکستان کی آگ کو دور سے دیکھتے اور اس کا فائدہ حاصل کرتے رہے لیکن ہماری انٹیلی جینس ایجنسیوں نے اسلامی تحریک کے افراد اور کارکنوں کو اس آگ کا ایندھن بنا دیا۔ البدر، الشمس اور مختلف ناموں سے اسلامی تحریک کے نوجوان مارے گئے اور قیمتی متاع ضائع ہوگئی۔ اس کا فائدہ اگر کچھ پہنچا تو وہ مشرقی پاکستان میں ٹکا خان کی حکومت کو تھا اور فوجی وسول بیوروکریسی کا یہ فائدہ بھی بس وقتی تھا۔ اسلامی تحریک کو نقصان ہی ہوا اور آج بھی وہ بنگلہ دیش میں صفایاں پیش کر رہی ہے۔

یحیٰی کے بعد جب بھٹو آئے تو وہ ایک فاتح اور عظیم سیاستدان تھے، ان کے سر پر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ٹوپی تھی اور گلیوں کوچوں میں ان کی ایسی حمایت تھی کہ وہ ملک کا نظام تبدیل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے خفیہ ایجنسیوں کا سہارا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اصل حاکم راؤ رشید اور سعید احمد خاں ہو گئے۔ پیپلزپارٹی کی جگہ فیڈرل سیکورٹی فورس کی حکومت آ گئی۔ اس نے پیپلزپارٹی کے کئی بڑے رہنماؤں کی تھانے اور قلعہ میں خوب مرمت کی۔ لوگوں کو کرپٹ کیا گیا یا دہشت زدہ کیا گیا۔ حکومت کا کوئی سیاسی نقطہ نظر اور سیاسی لائحہ عمل نہ رہا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر شکست خوردہ جاگیرداروں کو جھاڑ پونچھ کر مسند اقتدار پر سجایا گیا اور پیپلزپارٹی کے نظریاتی گروپ

کو پارٹی سے علیحدہ کیا گیا۔ اس دور میں بھی ساری سیاست خفیہ ایجنسیوں اور سیکورٹی فورس کی رہی۔ سعید احمد خان کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ وفاقی وزیر اس کے نام سے کانپتے تھے اور صوبائی وزیر یا وزراء اعلیٰ بھی انہیں خوش رکھنے کیلئے سو طرح کے جتن کرتے تھے۔ سرحد اور بلوچستان سے بھٹو صاحب کے گھتم گتھا ہو جانے کے بعد ایٹلی جینس اور سیکوریٹی ایجنسیوں کے اثر رسوخ میں مزید اضافہ ہوا۔

بھٹو کے بعد ضیاء الحق آئے تو بھی خفیہ ایجنسیوں نے اسلامی جمہوری اتحاد میں توڑ پھوڑ پیدا کی۔ اگر یہ لوگ متحد رہتے تو فوج کے مقابلے میں ایک سیاسی طاقت رہتی لیکن ہر سیاستدان انٹیلی جینس والوں سے پوچھتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے کیونکہ اپنے آپ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں قومی اتحاد منتشر ہو گیا اور ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی ہونے لگی۔

اس سارے ضیاء دور میں خفیہ ایجنسیوں کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا کہ پیپلزپارٹی کو کسی طرح توڑا جائے۔ اس کیلئے جے سندھ کی سرپرستی کی گئی' ایم کیو ایم بنائی گئی' شیعہ سنی تفرقہ بازوں کی دوکانیں سجائی گئیں' ادھر افغان مجاہد سب متحد تھے' ایک جماعت میں تھے' حکمت یار' برہان الدین' ربانی' مسعود' یونس خالص' سیاف سب میں اتحاد تھا اور ہماری آئی ایس آئی سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ اس نے ہر فریق سے کانا پھوسی کی کہ اپنی دکان الگ بناؤ' اپنا اسلحہ الگ حاصل کرو۔ اس کے نتیجے میں جو افغان رہنما متحد تھے وہ منتشر ہونے لگے اور اس انتشار کا عذاب اب افغانستان کے سر پر ہے۔ ضیاء حکومت کے بعد اسلامی جمہوری اتحاد بنا اور یہ بات اب کوئی راز نہیں ہے کہ اسے آئی ایس آئی نے بنایا تھا۔ جنرل اسلم بیگ اور کئی دوسروں نے اس راز کو اگل دیا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی تشکیل پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا اور اپنی پسند کا وزیراعظم بنانے کیلئے مسلسل ریشہ دوانیاں جاری کی گئیں' بے نظیر کو ہٹایا گیا لیکن اچانک نواز شریف درمیان میں آن دھمکے جبکہ ایجنسیوں نے جتوئی کو وزیراعظم بنانا طے کیا تھا کیونکہ وہ ایسے آدمی ہیں جن کی ملک میں اور سندھ میں کوئی جڑ بنیاد نہیں۔ اس طرح کا وزیراعظم ہی ایجنسیوں کا پسندیدہ ہو سکتا ہے اس لئے آج بھی نواز شریف کے مقابلے میں جتوئی اور جونیجو کو کھڑا رکھا گیا ہے کہ اگر نواز شریف ہلیں تو بے نظر نہ آئیں ان میں سے کوئی نواز شریف کی جگہ لے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ ہماری سول و فوجی بیوروکریسی اور خفیہ ایجنسیاں آپس میں بھی لڑ رہی ہیں۔ ان کی باہمی لڑائی نے خوفناک شکل اختیار کر رکھی ہے۔ ایک ایجنسی دوسرے کے خلاف اخبار نویسوں کو مواد فراہم کرتی ہے' اخبارات میں ہر روز ایک نئی کہانی پڑھنے کیلئے ملتی ہے اور یہ سب اچھے آثار نہیں ہیں۔ ملک کو کسی جگہ اس طرح نہیں چلایا گیا ہے۔ اگر ہمارے سیاستدان نہ مانے' اب بھی سبق نہیں سیکھا اور ہوشمندی کے ساتھ انہوں نے اپنی جوتم پیزار بند نہیں کی تو اس ملک میں سیاستدان ہونگے نہ سیاسی نظام اور جب یہ نہیں ہو گا تو ملک بھی نہیں ہو گا اس لئے اب بھی سیاستدان ہوش میں آئیں اپنے میں اعتماد اور اتحاد پیدا کریں اور خفیہ ایجنسیوں کو لگام دیں۔ امریکی انتخابات کے بعد اب نئے مسائل ہونگے اس لئے وطن کی فکر کر ناداں کہ مصیبت آنے والی ہے۔ پہلے تو امریکہ کے زیر سایہ زندگی کے دن گزر گئے اب یہ سایہ سر سے اٹھ گیا ہے اور بہتر ہے کہ سیاستدان مل کر نئی زمین بنا کر آسمان تیار کریں۔

بقیہ ---------- افتتاحیہ

اور ہمارے نزدیک پی ڈی اے کا یہ عذر بد تر از گناہ ہے کہ کچھ تخریب کار ہمارے جلوسوں میں داخل کردئے گئے تھے جنہوں نے شرارتوں کی شروعات کر کے ہمارے کارکنوں کے خون کو بھی گرم کردیا۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس جماعت یا گروہ کے کارکن اتنے ہوشیار اور محتاط نہ ہوں کہ تخریبی کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کو برقرار رکھ سکیں' اس کے پاس لوگوں کو سڑکوں پر لانے کا کوئی جواز نہیں۔ دوسری طرف حکومتی اقدامات سے جو بوئے خوں آرہی ہے' اسے بھی ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کا معاملہ کوئی آج کی بات نہیں لیکن عین اس نازک موقع پر دارو گیر کی اگلی پچھلی کسریں نکالنے کا پروگرام غیر ضروری تھا جس کے متعدد معانی نکالے جارہے ہیں۔ حکومت کا تازہ ترین کارنامہ خصوصی عدالتوں کے ان ججوں کو پیپلزپارٹی کے کارکنوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کے اختیار سے محروم کردینا ہے جنہوں نے آصف علی زرداری کو پچھلے دنوں چھ مقدمات سے بری کیا اور ان سرکاری اہلکاروں کی معطلی ہے جو ان مقدمات کی پیروی پر متعین تھے۔ حکومت نے خصوصی عدالتوں کی تشکیل کے وقت ان میں عاجلانہ انصاف کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے یقیناً ججوں کی اہلیت کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہوگا۔ اس کے باوجود آصف علی زرداری کی بریت کے خلاف اگر حکومت نے کسی اعلیٰ تر عدالت میں اپیل کی ہے تو یہ اس کا قانونی حق تھا لیکن متذکرہ صدر اقدام میں پورے ملک کی عدلیہ کے لئے ایک واضح اشارہ موجود ہے کہ جن ملزموں کو ہم مجرم قرار دلوانا چاہتے ہیں' ان پر جرم ثابت ہونا چاہیے اور سزا بھی اتنی ملنی چاہیے جس سے ہماری تسلی ہوجائے۔ ہماری رائے میں یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے حربے آزما کر حکومت ملک کی سیاسی فضا میں خون کا رنگ لانے اور آگ کی تپش پیدا کرنے کے درپے ہے جو شاید کسی درجے میں ان کے لئے تو عارضی کامیابی کا باعث بنے ورنہ ملک خداداد کے حق میں سم قاتل ثابت ہوگی۔

ان خدشات کے اظہار کے بعد بھی ہم بس خواہش ہی کرسکتے ہیں کہ حزب اختلاف ہوش کا دامن تھامے اور حکومت بھی عقل کے ناخن لے ورنہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ ہے تو پاکستان کے مسلمان کس کی ماں کو روئیں گے اور کس سے فریاد کرنے کی حیثیت میں ہوں گے ---- اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے خون کے ان پیاسوں کی پیاس بجھانے کا کوئی اور انتظام کردے' اس خطہ زمین کی بقاء و سلامتی کی کوئی راہ نکالے جو ہم نے خود اس سے مانگ کر لیا تھا اور ہمارے لئے نہیں تو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ہی پاکستان کو سلامتی کا وہ گہوارا بنادے جو وہ اسلام کے دامان رحمت سے وابستہ ہوئے بغیر ہرگز نہ بن سکے گا۔ البتہ اس دعا کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹھنا ہمیں زیب نہیں دیتا بلکہ ہماری دعا کا اثر کے ساتھ دشمنی کا رشتہ بھی قائم کرتا ہے' تو اٹھئے اور کسی ایسے قافلے کے ساتھ شریک سفر ہوجایئے جس کی منزل اس خطہ زمین میں اسلامی انقلاب ہو' راستہ چاہے طویل ہو' خاردار ہو' سنگریزوں سے اٹا ہوا ہو۔○○

انقلاب نبوی کی تکمیل ہجرت پر ہوئی یا فتح مکہ کے بعد؟

ایک غلط فہمی پر مبنی بودا استدلال

ہجرت کے بعد مدینہ اسلامی ریاست نہیں بنا' محض بطور "دارالسلام" میسر آیا تھا

ایسی بھی کیا جلدی' یہ حضرات میری بات پوری تو ہونے دیں!

(نوائے وقت کے شکریئے کے ساتھ)

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کا وہ اصل انقلابی فکر کیا ہے جس نے اب سے چودہ سو سال قبل ریگزار عرب میں اس انقلاب کو جنم دیا تھا جسے پوری دنیا نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین' جامع ترین اور صالح ترین انقلاب تسلیم کیا ہے' اور جس کے نتیجے میں " خلافت راشدہ" کی صورت میں وہ نظام عدل اجتماعی ' خواہ تھوڑی مدت ہی کے لئے سہی ' لیکن بالفعل قائم ہوگیا تھا جس میں انسانی حریت' اخوت اور مساوات کی جملہ اعلیٰ اقدار کو نہایت صحیح اور موزوں نسبت و تناسب اور توازن و اعتدال کے ساتھ سمویا گیا تھا' اور جس کی یاد اب نوع انسانی کے اجتماعی حافظے میں ایک حسین خواب کے مانند محفوظ ہے؟' پھر خلافت راشدہ کے اختتام پر ' جب مسلمانوں کا نظام حکومت تدریجاً" پہلے مجرد " خلافت" اور اس کے بعد باضابطہ "ملوکیت" میں تبدیل ہوگیا تو اس سے دین و دنیا اور مذہب و سیاست میں جو علیحدگی ہوئی اس سے مسلمانوں کے دینی فکر اور مذہبی تصورات میں کیا تنزل رونما ہوا جو مغربی استعمار کے دو سو سالہ دور میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ گیا؟'--- پھر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام کے انقلابی فکر کا تدریجی احیاء کن عظیم شخصیتوں کے ہاتھوں ہوا؟--- اور بالخصوص برعظیم پاک و ہند میں اس ضمن میں پہلے علامہ اقبال نے اپنی پر شکوہ اور جذبہ پرور شاعری اور پھر مولانا مودودی نے اپنی سلیس عام فہم اور دلنشین نثر کے ذریعے کیا کردار ادا کیا ؟'--- اور پھر جماعت اسلامی میں کچھ عرصہ فعال اور سرگرم رہنے اور اس فکر کے پر جوش مبلغ اور پرچارک رہنے کے بعد جب بھارت میں مولانا وحید الدین خان اس سے علیحدہ ہوئے اور پاکستان میں علامہ جاوید احمد غامدی اس سے " خارج" کردئے گئے تو وہ اس فکر کو کس طرح مسخ اور مجروح کر کے اس کے رخ کو دوبارہ دور انحطاط کی جانب موڑنے کی کوشش کررہے ہیں؟ یہ تمام سوالات نہایت اہم ہونے کے ساتھ ساتھ طوالت طلب بھی ہیں--- تاہم ان شاء اللہ ان سب کا جواب ان کالموں میں اختصار اور تدریج کے ساتھ دیا جائے گا۔

سردست غامدی صاحب کی صرف اس تحریر کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنی مقصود ہیں جو " نوائے وقت" میں ۸ ر تا ۱۶ر ستمبر چار اقساط میں اور ایک دوسرے روزنامے میں یکشت لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ شائع ہوئی ہے ۔ اور اس ضمن میں پہلے تین باتیں تمہیدی نوعیت کی ہیں ' اور پھر تین ہی اصل بحث کے متعلق ۔

تمہیدی باتوں میں اولین یہ کہ میں ڈاکٹر محمد امین صاحب کی طرح غامدی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بھی اس منہج انقلاب کی تعبیر(دو غلطیوں کے سوا) بہت حد تک صحیح کی ہے جو میں نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ ۔

"دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی' کئی دور چل گئے!"

کے مصداق میری اپنی تحریر کے مکمل ہونے سے پہلے اگر اس کے خلاصے کی اس طرح "گردان" ہوتی رہی تو ان شاء اللہ کم از کم قارئین " نوائے وقت " کو تو وہ از بر ہوجائے گا۔ فجزا ھما اللہ احسن الجزاء!

دوسری بات یہ کہ میں اس امر پر تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان حضرات کو اس معاملے میں اس قدر عجلت کیوں ہے کہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی تردید پر کمربستہ ہوگئے ہیں ۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ذرا توقف کرلیا جائے اور میری بات کو مکمل ہولینے دیا جائے۔ اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے ۔ بصورت دیگر تنقید زیادہ جامع بھی ہوگی اور جاندار بھی تاہم اس کے فیصلے کا اختیار ان ہی کے ہاتھ ہے!

تیسری بات متذکرہ بالا دو غلطیوں سے متعلق ہے --- یعنی ایک یہ کہ میں نے انقلابی جدوجہد کے جن چھ مراحل کا استنباط سیرت النبیؐ سے کیا ہے ان میں کبھی " ہجرت" کو مستقل مرحلے کی حیثیت سے شمار نہیں کیا ۔ اس سے قبل ڈاکٹر محمد امین صاحب نے بھی ہجرت کا تذکرہ کیا تھا لیکن چونکہ اس میں حوالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکہ آلاراء تصنیف " دعوت دین اور اس کا طریق کار " کا تھا اس لئے میں نے سکوت اختیار کیا تھا۔ اس لئے کہ میں اس کتاب کی علمی قدر و قیمت ' اور صحت استدلال کا تہہ دل سے قائل ہوں ' تاہم اب چونکہ بات بلا حوالہ آئی ہے تو عرض ہے کہ اگرچہ میرے نزدیک آنحضورؐ کی انقلابی جدوجہد کے چوتھے مرحلے یعنی صبر محض یا عدم انتقام کے دور سے نکل کر پانچویں مرحلے یعنی

اقدام، چیلنج اور جوابی کارروائی کے دور میں داخلے کے ضمن میں ہجرت مدینہ کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے، اور اب بھی اگر حالات تقاضا کریں اور بالفعل کوئی "دارالہجرت" موجود بھی ہو تو یہ راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے (جیسے کہ حال ہی میں جہاد افغانستان کے سلسلہ میں ہوا!) تاہم جیسے کہ بعد میں تفصیلاً عرض کیا جائے گا، تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں جس طرح مسلح تصادم لازم نہیں رہا بلکہ احتجاجی تحریک اور ترک موالات کے ذریعے بھی انقلاب کا آخری مرحلہ سر کیا جاسکتا ہے، اسی طرح "ہجرت" کا مرحلہ بھی لازمی نہیں رہا۔ ہاں ایک ہجرت لازمی ہے، یعنی وہ جس کی وضاحت نبی اکرمؐ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ "یا رسول اللہ! سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟" تو آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا تھا: "یہ کہ تم ہر اس چیز یا عمل کو ترک کردو جو تمہارے رب کو ناپسند ہے!" (نسائیؒ عن عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن العاص) تاہم اس ہجرت کا تعلق انقلابی جدوجہد کے تیسرے مرحلے یعنی "تربیت" سے ہے۔

اسی طرح "خاموش اکثریت" کے بارے میں بھی میرے موقف کی تعبیر صحیح طور پر نہیں کی گئی۔ میرے نزدیک "خاموش اکثریت" خاموش تو ہوتی ہے، اندھی بہری نہیں ہوتی، اور جب وہ انقلاب کے داعیوں اور کارکنوں کی سیرت و کردار اور قربانی و ایثار، اوران پر ہونے والے ظلم و تشدد کا مشاہدہ کرتی ہے تو اس کی ہمدردیاں رفتہ رفتہ ان کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں اور آخری تصادم کے مرحلے میں یہ تبدیلی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔

اصل بحث کی طرف آیئے تو اس کے ضمن میں اہم ترین معاملہ ایک "مغالطہ" کا ہے (جس کے بارے میں نہیں کہاجاسکتا کہ وہ غامدی صاحب کو کسی غلط فہمی کے باعث لاحق ہوگیا ہے یا وہ ضدم ضدا کے باعث اسے جان بوجھ کر دوسروں کو لاحق کرنے کی کوشش کررہے ہیں) اور وہ یہ کہ ہجرت کے فوراً بعد بلکہ اس سے بھی قبل مدینہ منورہ میں انقلاب کی تکمیل ہوچکی تھی اور وہاں صرف "دعوت" کے نتیجے میں ایک اسلامی حکومت یا ریاست قائم ہوچکی تھی۔ گویا اس کے بعد کے مراحل انقلاب کی توسیع کے ہیں، نفس انقلاب کے نہیں! جبکہ میرا موقف یہ ہے کہ ہجرت کے بعد اگرچہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو "دارالامن" میسر آگیا تھا جسے "دارالسلام" بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اور مجازاً یا استعارہ کے طور پر اسلامی حکومت یا ریاست سے بھی تعبیر کیا جاسکتا (جیسے کہ بعض مصنفین نے کیا ہے) لیکن یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ حکومت اور ریاست کی اصطلاح سے جو چیز آج کی دنیا میں معروف ہے وہ جزیرہ نمائے عرب میں فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس سے قبل مسلمانوں کی حیثیت ایک انقلابی جماعت کی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت تو یہ تھی کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسولؐ تھے اور دوسری یہ کہ آپؐ مسلمانوں کی اس جماعت کے امیر اور امام تھے!۔

حکومت اور جماعت کے مابین بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ جماعت کی کوئی علاقائی عملداری (ٹیری ٹوریل جیورسڈکشن) نہیں ہوتی اور اس میں شرکت و شمولیت بھی اختیاری (والنٹری) ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علیحدگی کا اختیار بھی ہر دم حاصل رہتا ہے، پھر اس میں کام بھی رضا کارانہ کیا جاتا ہے اور کارکنوں سے زیادہ تندہی سے کام کرانے کے لئے صرف ترغیب و تشویق سے کام لیا جاتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ جماعت سے اخراج کی وعید سنائی جاسکتی ہے، کوئی عملی سزا نہیں دی جاسکتی --- جبکہ حکومت کی ایک علاقائی عملداری ہوتی ہے، اور اس علاقے میں رہنے والے سب لوگ اس میں لامحالہ شامل ہوتے ہیں اور انہیں اس کے احکام کی اطاعت مجبوراً کرنی پڑتی ہے اور اس علاقے سے نکلے بغیر اس کے احکام سے سرتابی جرم یا بغاوت کے ہم معنی قرار پاتی ہے جس کی سزا لازمی ہوتی ہے۔

اس اصولی فرق و تفاوت کو سامنے رکھتے ہوئے اب فتح مکہ سے قبل اور اس کے بعد کے حالات پر نظر ڈالئے تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے کہ شوال ۳ ھ میں غزوہ احد کے موقع پر "مسلمانوں" کی جماعت میں سے ایک تہائی تعداد میدان جنگ سے واپس ہوگئی لیکن اس پر نہ کسی باز پرس کا ذکر سیرت مطہرہ میں ملتا ہے نہ سزا یا عقوبت کا (حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی "حکومت" میں ہو تو کورٹ مارشل اور سخت ترین سزا لازم ہے!) اسی طرح ۶ھ میں عمرہ کے لئے چلنے کے لئے نفیرعام تھی یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نہیں گئے ان پر سورۂ فتح میں شدید تنقید بھی کی گئی اور زجر و توبیخ سے بھی کام لیا گیا لیکن معلوم ہے کہ اس پر کسی معین شخص کا کوئی محاسبہ کیا گیا نہ سزا دی گئی --- جبکہ اس کے برعکس غزوہ تبوک کے موقع پر جو لوگ بغیر پیشگی اجازت حاصل کئے عملاً شریک نہ ہوئے ان کا محاسبہ بھی ہوا اور صرف ان منافقین سے اعراض کرتے ہوئے جنہوں نے جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا کر اپنے آپ کو بچا لیا، جن مخلص مسلمانوں نے قصور کا اعتراف کیا انہیں بالفعل سزا دی گئی، اور منافقوں کے خلاف بھی اگرچہ فرداً فرداً تو کوئی اقدام نہیں کیا گیا لیکن ان کے مسجد نما مرکز (مسجد ضرار) کو مسمار کردیا گیا

مزید برآں غور کیجئے کہ کیا کوئی "حکومت" ایسی بھی ہوسکتی ہے جس کے شہریوں کو یہ اختیار حاصل ہو کہ چاہیں تو اپنے مقدمات حکومت کی قائم کردہ عدالتوں سے طے کرائیں اور چاہیں تو کہیں اور لے جائیں۔ اور کیا کسی حکومت کے لئے جائز ہے کہ اپنے شہریوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے اور ان کے جھگڑوں کو چکانے سے احتراز کرے --- جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں بالفعل یہ بھی ہوتا تھا کہ اوس اور خزرج کے منافق اپنے مقدمات نبی اکرمؐ کی بجائے یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے اور خود آنحضورؐ کو بھی اجازت تھی کہ آپ چاہیں تو ان کے مقدموں اور جھگڑوں کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو انکار کردیں۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۴۲)

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ہجرت کے بعد بھی کم از کم فتح مکہ تک ابھی انقلابی جدوجہد کا سلسلہ جاری تھا، اور مسلمانوں کی حیثیت ایک انقلابی جماعت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں تو ان کے لئے "امت" یعنی ہم مقصد لوگوں کا لفظ استعمال ہوا ہے اور سورۂ مائدہ اور سورۂ مجادلہ میں "حزب اللہ" یعنی

یہ ایک مغالطہ ہے جو غلط فہمی کے باعث لاحق ہوگیا یا ضدم ضدا کا نتیجہ ہے

اللہ کی پارٹی یا جماعت کا! --- اور حکومت یا ریاست کا لفظ تو خیر پورے قرآن میں کہیں آیا ہی نہیں، اس کے مترادف الفاظ بھی کہیں استعمال نہیں کیے گئے --- اس لئے کہ باضابطہ "حکومت" قائم ہی اس وقت ہوئی تھی جب وحی کی "تنزیل" اختتام کو پہنچ رہی تھی --- اور واقعہ یہ ہے حکومت و ریاست اور کسی باقاعدہ اور باضابطہ نظام کا بالفعل ظہور تو دراصل "خلافت راشدہ" کے دوران ہوا ہے!

مزید غور کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک مسلمانوں کی "جماعت" میں یہ درجہ بندی برقرار رہی کہ عہد حاضر کی اصطلاح کے مطابق اصل "ارکان جماعت" تو صرف وہ مہاجرین مکہ تھے (رضی اللہ عنہم) جو مکہ مکرمہ میں نبی اکرم کی تعلیم اور تربیت و تزکیہ سے بھی بھرپور طور پر فیضیاب ہو چکے تھے اور نہ صرف یہ کہ وہاں شدید مصیبتوں اور آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گذر کر کندن بن چکے تھے بلکہ گھربار اور اہل و عیال کو کفار مکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر کے اپنے ایمان و یقین، اور خلوص و اخلاص کا آخری ثبوت بھی فراہم کر چکے تھے --- جبکہ انصار مدینہ کی اصل حیثیت "معاونین" اور "پناہ دینے والوں" کی تھی - یہی وجہ ہے کہ غزوہ بدر سے قبل کی آٹھ مہموں میں، جن میں سے بعض سرایا تھے اور بعض غزوات (اس لئے کہ ان میں خود آنحضورؐ نے بھی بنفس نفیس شرکت فرمائی تھی) صرف مہاجرین کو شریک کیا گیا تھا اور کسی انصاری کو شامل نہیں کیا گیا -- یہاں تک کہ غزوہ بدر سے قبل کی مشاورت میں بھی جبکہ آنحضورؐ کو وحی الٰہی نے مطلع فرما دیا تھا کہ ایک لشکر جرار مکہ سے روانہ ہو چکا ہے، آپؐ نے انصار مدینہ کو مہم میں شرکت کا "حکم" نہیں دیا جبکہ مشورہ طلبی کے جواب میں مہاجرینؓ کی جانثارانہ اور سرفروشانہ تقاریر کے باوجود مزید توقف فرما کر صرف اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا جس پر رئیس انصار حضرت سعد ابن عبادہؓ بول اٹھے کہ: "یا رسول اللہ! غالباً آپ کا روئے سخن ہماری جانب ہے!" اور اس کے بعد بھی انہوں نے حوالہ "بیعت سمع و طاعت" کا نہیں دیا (اس لئے بھی کہ آنحضورؐ نے کوئی حکم تو دیا ہی نہیں تھا کہ اطاعت کا سوال پیدا ہوتا اور اس لئے بھی کہ بیعت عقبہ کے موقع پر طے یہ ہوا تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو ہم آپ کی حفاظت بالکل اسی طرح کریں گے جیسی اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں اور یہاں ابھی مدینہ پر حملہ کی صورت پیش نہیں آئی تھی!) بلکہ یہ عرض کیا کہ "ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں، اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے!" ---- تو غور فرمائیے کہ یہ ساری صورت "رضاکارانہ" تعاون کی ہے یا حکومت کے فوجی ڈسپلن کی جس میں فوج کے لئے رضاکارانہ بھرتی ہوتی ہے تب بھی سب شہریوں میں سے یکساں طور پر، اور اگر جبری خدمت لی جاتی ہے تب بھی سب سے برابری کے ساتھ -- لہٰذا اگر وہاں معاملہ "انقلاب" کی تکمیل اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد انقلاب کی توسیع کا ہوتا تو کسی بھی مرحلے پر مہاجرین اور انصار کے مابین کوئی فرق ہرگز روا نہ رکھا جاتا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ غزوہ بدر کے بعد سورۃ انفال نازل ہوئی تو اس میں بھی مسلمانوں کی جماعت کے ان دونوں حصوں کے لئے جدا جدا الفاظ استعمال ہوئے یعنی مہاجرین کے لئے "یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے، اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا" --- اور انصار مدینہ کے لئے صرف یہ کہ "اور وہ جنہوں نے پناہ دی، اور مدد کی!" (آیت نمبر ۷۴) البتہ فتح مکہ کے بعد جب معاملہ "حکومت" کی صورت اختیار کر گیا اور سب اس کے یکساں شہری بن گئے تو سورۃ توبہ میں مہاجرین اور انصار کو ان الفاظ میں یکجا اور یکساں کر دیا گیا کہ: "مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ سابقون الاولون میں شامل ہیں، اور وہ جنہوں نے حسن و خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ بھی ان سب سے راضی ہو گیا، اور وہ سب بھی اللہ سے راضی ہو گئے!" (آیت نمبر ۱۰۰)

> **عرب میں کوئی ڈھیلی ڈھالی "مذہبی حکومت" قائم تھی تو اس کا صدر مقام مکہ تھا۔**

اس بحث کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اگرچہ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی باضابطہ حکومت یا سلطنت قائم نہیں تھی، تاہم اگر کسی درجہ میں ایک ڈھیلی ڈھالی "مذہبی حکومت" قائم تھی تو اس کا صدر مقام مکہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اسے "ام القریٰ" یعنی بستیوں کی ماں یا جڑ سے تعبیر کیا گیا۔ اور عرب کے حاکموں کی حیثیت اگر کسی کو حاصل تھی تو وہ صرف قریش تھے، یہی وجہ ہے کہ نص قرآنی میں بھی انہیں "ائمہ کفر" (سورۃ توبہ آیت ۱۲) قرار دیا گیا --- اور حدیث نبویؐ نے بھی "الائمۃ من قریش" کے الفاظ کے ذریعے اس کی مزید تاکید کر دی۔ گویا جب تک مکہ پر فتح کا پرچم نہ لہرا دیا جاتا عرب میں نہ کسی حکومت کے قیام کا سوال پیدا ہو سکتا تھا نہ انقلاب کی تکمیل کا۔ اس سے قبل کسی محدود علاقے میں مسلمانوں کو "دار الامن" میسر آجانا اور اس میں ایک محدود حد تک نبی اکرمؐ کے احکام کا ان لوگوں پر جاری ہو جانا جو از خود رضاکارانہ طور پر اس کے خواہاں ہوں بالکل دوسری بات ہے، --- (چنانچہ ہجرت مدینہ سے قبل یہی حیثیت مکہ میں "دار ارقمؓ" کی تھی جو ان سب نوجوان مسلمانوں کے لئے پناہ گاہ بن گیا تھا جنہیں گھروں سے نکال دیا جاتا تھا --- اور اس سے بھی قبل یہی معاملہ خود حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے مکان یعنی کاشانہ نبوتؐ کا تھا کہ اس کی چار دیواری کے اندر "اسلامی حکومت" بالفعل قائم تھی جہاں نبی اکرمؐ حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ کی معیت میں "نماز باجماعت" بھی ادا فرماتے تھے، اور ظاہر ہے کہ آپؐ کے احکام بھی جاری و نافذ تھے!)

الغرض، یہ خیال کہ مدینہ منورہ میں ہجرت سے قبل ہی "انقلاب" کی تکمیل ہو گئی تھی اور ہجرت کے فوراً بعد ایک اسلامی حکومت یا ریاست قائم ہو گئی تھی صرف "خیال خام" ہی نہیں، تاریخی حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے!

یہیں سے ایک نہایت مشکل سوال کا آسان حل بھی مل جاتا ہے، یعنی یہ کہ کیا وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں نبی اکرمؐ بنفس نفیس بارہ برس تک دعوت و تبلیغ، اور تعلیم و تلقین کے فرائض ادا کرتے رہے لیکن وہاں آپؐ کی "دعوت" سے تو انقلاب نہیں آیا بلکہ حالات رفتہ رفتہ اس درجہ ناموافق اور نامساعد ہوتے چلے گئے کہ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑی۔

جبکہ یثرب میں ابھی آپؐ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں تھے کہ اولاً حج کے موقع پر چند لوگوں کے ایمان لانے اور بعد ازاں ان کی اور آپؐ کے مکہ سے بھیجے ہوئے ایک دو جانثاروں کی دعوت و تبلیغ سے دیکھتے ہی دیکھتے اتنی کامیابی حاصل ہوگئی کہ وہ "دار الہجرت" بننے کی سعادت کا اہل ہوگیا؟ ہمیں نہیں معلوم کہ غامدی صاحب نے اس اہم سوال پر غور کیا ہے یا نہیں اور کیا ہے تو ان کے پاس اس کا کیا جواب ہے ' بہرحال ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ نہ صرف یہ کہ پورے عرب کی بے ضابطہ مذہبی حکومت کا صدر مقام تھا--- بلکہ بجائے خود بھی صرف ایک قبیلہ کا شہر ہونے کی بنا پر ایک نہایت مضبوط "حکومت" کا حامل تھا۔ جس کی ایک پارلیمنٹ بھی تھی (دارالندوہ) اور مختلف منصب اور عہدے بھی تھے۔ لہٰذا وہاں انقلاب کی تکمیل کے تقاضے زیادہ کٹھن تھے۔ جبکہ یثرب میں اس اعتبار سے ایک "خلا" کی سی کیفیت تھی اور اس کی حیثیت پانچ قبیلوں کے مابین ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے "وفاق" کی تھی جس میں کوئی "مرکزی حکومت" سرے سے موجود ہی نہیں تھی ۔ پھر ان پانچ قبیلوں میں سے بھی جو دو قبیلے اصل "مالکان دیہہ" کی حیثیت رکھتے تھے' یعنی اوس اور خزرج' ان کے مابین کچھ ہی عرصہ قبل طویل اور نہایت خونریز جنگ ہوچکی تھی ۔ گویا وہ سرزمین کسی "ثالث بالخیر" کی منتظر تھی جو اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں میسر آگیا!اور آپؐ نے کمال تدبر و فراست کے ساتھ متذکرہ بالا "خلا" کو اپنی "جماعت" کے ذریعے پر کر کے اسے اپنے مقصد بعثت یعنی غلبہ دین حق کی "انقلابی جدوجہد" کے لئے استعمال فرمالیا۔ تاہم تھا یہ صرف ایک جماعتی نظام جس کے ساتھ یثرب کا قدیم قبائلی نظام جس پختگی کے ساتھ برقرار رہا تھا اس کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی اذیت رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی سے پہنچی وہ آپؐ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ : " کیا کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو مجھے اس شخص سے بچا سکے جو مجھے میرے گھر والوں کے بارے میں ایذا دے رہا ہے؟" (زاد المعاد : جلد دوم) لیکن مدینہ کا قبائلی نظام اتنا محکم تھا کہ رئیس خزرج حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آنحضورؐ کو تو صرف "مصلحت بینی" کا مشورہ دینے پر اکتفا کی' لیکن اوس کے سردار حضرت اسید ابن حضیرؓ سے یہاں تک کہہ دیا کہ تم عبداللہ ابن ابی کی مخالفت میں اتنے تیز و تند جذبات کا مظاہرہ اس لئے کررہے ہو کہ وہ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا ہے ۔ جس کا جواب حضرت اسیدؓ نے بھی ترکی بہ ترکی دیا--- تاہم عبداللہ ابن ابی کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جاسکی!--- تو غور فرمایئے کہ یہاں آنحضورؐ کی حیثیت ایک "حاکم" کی نظر آرہی ہے یا ایک ایسی جماعت کے امیر اور امام کی جس کی ریڑھ کی ہڈی تو مہاجرین پر مشتمل تھی ' لیکن تعداد کے اعتبار سے زیادہ اور اہم تر لوگ اوس اور خزرج سے تعلق رکھنے والے وہ انصار تھے جن میں جہاں مومنین صادقین بھی کثیر تعداد میں موجود تھے وہاں معتدبہ تعداد میں ضعفاء اور منافقین بھی شامل تھے اور ان سب کا تعلق جہاں ایک جانب بحیثیت مسلمان آنحضورؐ کے ساتھ قائم ہوگیا تھا' وہاں اپنے قبائلی نظام کے ساتھ بھی پوری طرح شدت کے ساتھ برقرار تھا!

اس مرحلے پر ' ان لوگوں سے قطع نظر جو اسلامی انقلاب کی جدوجہد کو ع

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!"

کے مترادف سمجھتے ہوں ' اور اپنے ذہن و فکر کی جملہ صلاحیتوں کو ۔

" تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!"

کے مصداق اس سے گریز اور فرار کی راہیں تلاش کرنے ہی میں صرف کرنا چاہیں ' ایسے تمام لوگوں کو جو اسلامی انقلاب سے حقیقی اور عملی دلچسپی رکھتے ہوں اپنی بصیرت میں اضافے کے لئے اس سوال پر غور کرلینا چاہیے کہ اگر مکہ مکرمہ میں آنحضورؐ کا اپنی انقلابی جدوجہد کو جاری رکھنا اس لئے مشکل ہوگیا تھا کہ وہاں ایک حکومتی نظام موجود تھا' چنانچہ اس جدوجہد کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ' اور آپؐ کے صحابہؓ کو مدینہ منورہ میں "پناہ دی" (سورۂ انفال آیت ۲۶) جہاں حکومت کا "خلا" تھا---- تو آج کی دنیا میں جہاں ہر جگہ مضبوط حکومتیں قائم ہیں جو اپنے ملک میں رائج اجتماعی نظام یعنی "پولیٹیکو-سوشیو - اکنامک سسٹم" کی محافظ ہوتی ہیں اور جن کے پاس بری ' بحری اور فضائی افواج کی کثیر تعداد کے علاوہ سول آرمڈ فورسز کی بھی بڑی جمعیت موجود ہوتی ہے ' کوئی انقلابی جدوجہد کیسے کامیاب ہوسکتی ہے؟

اس سوال کا "اشکال" مزید بڑھ جاتا ہے اگر اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے کل بیس برس کی قلیل مدت میں انقلاب کی معجزانہ تکمیل میں جہاں اصل دخل آپؐ کی بے داغ سیرت اور معجزانہ کردار ' اور آپؐ کی اور آپ کے صحابہؓ کی بے مثال محنت و مشقت اور عدیم النظیر قربانیوں ' جانفشانیوں' اور سرفروشیوں کو حاصل تھا' وہاں کچھ نہ کچھ عمل دخل اس کیفیت کو بھی تھا کہ اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں کوئی ایسی منظم اور مستحکم حکومت قائم نہیں تھی جو انقلاب کا راستہ پوری قوت کے ساتھ روک سکتی ۔ اس پر فطری طور پر یہ سوال زیادہ گھمبیر اور شدید ہوجاتا ہے کہ آج کسی ایسے ملک مثلاً پاکستان میں انقلاب کا خواب کیسے دیکھا جاسکتا ہے ' جہاں ایک مستحکم حکومتی نظام اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ موجود ہو جو رائج الوقت سیاسی و معاشی نظام یعنی جاگیرداری اور سرمایہ داری ہی کے بل پر وجود میں بھی آتا ہو اور پھر اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی حفاظت بھی کرتا ہو!

اس سوال کا جواب ' یہ ہے کہ عہد حاضر میں تمدنی ارتقاء کے ذریعے "حقوق انسانی" کا جو تصور پروان چڑھا اور پوری دنیا میں تسلیم شدہ ہے اس کی رو سے عوام کو عقیدہ' خیال اور نظریئے کی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ حق بھی حاصل ہے کہ اس کا اظہار و اعلان بھی کریں ' اور تبلیغ و اشاعت بھی ۔ مزید برآں شہریوں کا یہ حق بھی اب پوری طرح تسلیم شدہ ہے کہ وہ جماعتیں اور تنظیمیں بنائیں اور وقت کی حکومت ہی نہیں رائج الوقت نظام کو بھی بدلنے کی کوشش کریں' بشرطیکہ امن عامہ میں خلل نہ ڈالا جائے اور کسی کی جان ' مال ' عزت ' آبرو اور املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے--- پھر تبدیلی کی یہ کوشش انتخابات میں حصہ لے کر بھی کی جاسکتی ہے ' اور پر امن مظاہروں اور احتجاجی تحریکوں کے ذریعے بھی ' یہ دوسری بات ہے کہ انتخابات کے ذریعے صرف "حکومت" کو بدلا جاسکتا ہے "نظام" کو نہیں! اور انقلاب چونکہ نظام کو بدلنے کا نام ہے لہٰذا اس کے لئے احتجاجی تحریک (ریزسٹنس موومنٹ) کے

سوا کوئی اور چارہ کار موجود نہیں ہے۔

اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ عہد حاضر میں "انقلاب" کے لئے "مسلح بغاوت" ضروری نہیں ہے (اگرچہ ڈاکٹر محمد امین کی طرح غامدی صاحب بھی بجا طور پر فقہ اور شریعت کی رو سے اس کی مشروط اجازت کے قائل ہیں اور ان ہی کی طرح انہوں نے بھی اس کے بارے میں فقہی مباحث پر خواہ مخواہ زور انشاء صرف کیا ہے حالانکہ نہ یہ معاملہ مابہ النزاع ہے' نہ ہی ہمارے نزدیک عہد حاضر میں انقلاب کے لئے قتال ناگزیر ہے!)--- اسی طرح عہد حاضر میں "ہجرت" بھی لازم رہی ہے (اگرچہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اگر اس کا امکان موجود ہو تو اس سے بلاشبہ انقلابی جدوجہد میں آسانی اور سہولت حاصل ہوسکتی ہے!)

بحث کے آخری اور تیسرے نکتے پر گفتگو کے آغاز کے لئے الحمد للہ کہ ہمارے پاس ایک متفقہ اساس موجود ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ چونکہ راقم الحروف کو غامدی صاحب کی بعض سابقہ تحریروں کی بنا پر یہ گمان تھا کہ شاید وہ بالکلیہ اسی "معذرت خواہ" مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں' جو ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کے عسکری' سیاسی' سائنسی اور نفسیاتی غلبے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا' لہٰذا ہمیں اس سے بہت خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے نہایت واضح اور برملا الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ:

"قرآن مجید کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرہ نمائے عرب میں اس توسیع (یعنی اسلامی انقلاب کی توسیع) کے لئے اسی طرح مامور تھے جس طرح آپؐ کے بعد آپؐ کی یہ امت عالم کے آخری کناروں تک اس کی توسیع کے لئے مامور ہے۔" اور "رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ خلفائے راشدینؓ کی قیادت میں روم و ایران کی بادشاہتوں میں اس کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے ان کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر کہا تھا: اسلام لاؤ' جزیہ دو' یا لڑنے کے لئے تیار ہوجاؤ!"

لیکن اب جناب غامدی اور ان کے ہم خیال لوگ ذرا غور فرمائیں کہ اس اعتراف اور اعلان کے بعد: (i) کیا "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے طعنے اور اس قبیل کے دوسرے طنز اور استہزاء کے تیر جو انہوں نے ہم پر برسائے ہیں وہ سب کے سب "بر کلہ خودی نمائند!" کے مصداق ان ہی کی جانب نہیں لوٹ رہی؟ (ii) کیا اس سے ان کا یہ نظریہ کہ انقلاب "دعوت اور صرف دعوت" سے آتا ہے' باطل نہیں ہوجاتا؟۔ اور (iii) کیا ان کے تجزیئے کے مطابق یہ درست نہ ہوگا کہ کوئی سرپھرا پاکستان کے کسی ایک گاؤں میں "دعوت اور صرف دعوت" کے ذریعے "انقلاب" برپا کر کے پہلے پورے پاکستان اور پھر پوری دنیا میں اس کی "توسیع" کے لئے "جہاد و قتال" کا اعلان کردے؟ اس پر اگر وہ یہ کہیں کہ ان کی مراد پورے ملک سے ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے کہ مدینہ منورہ پورا ملک تھا یا اس کا صرف ایک شہر اور وہ بھی "ام القریٰ" نہیں بلکہ صرف ایک عام قریہ؟ بتیوا توجروا!

ہمیں یقین ہے کہ اگر غامدی صاحب ان سوالات پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرلیں گے تو ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہوجائے گی کہ بحمد اللہ نظریاتی اعتبار سے ہمارے اور ان کے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں ہے' اور ہم اصلاً ایک ہی فکر کے خوشہ چین ہیں۔ چنانچہ یہ امور ہمارے مابین متفق علیہ ہیں کہ: (i) نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت غلبہ دین حق تھا۔ (ii) آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے: ایک اہل عرب کی جانب' اور دوسری پوری نوع انسانی کی جانب (iii) پہلی بعثت کے جملہ فرائض آپؐ نے اپنی حیات طیبہ کے دوران ہی بنفس نفیس پورے کردئے۔ چنانچہ اہل عرب پر اتمام حجت کا حق بھی ادا کردیا' اور جزیرہ نمائے عرب پر غلبہ دین حق کی تکمیل بھی فرمادی---- یہی وجہ ہے کہ مشرکین عرب کو سورۂ توبہ کی آیات ۱ تا ۶ میں آخری الٹی میٹم دیدیا گیا کہ یا ایمان لائیں ورنہ تہ تیغ کردئے جائیں گے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ بالفعل اس کی نوبت نہیں آئی اور تمام تمام مشرکین عرب ایمان لے آئے!) (iv) بقیہ عالم انسانی کے ضمن میں ان دونوں فرائض کی ادائیگی کا بار امت کے کاندھوں پر ہے' جسے صحابہ کرامؓ نے خلافت راشدہ کے دوران ایک حد تک تو پورا کردیا تھا' تاہم۔

"وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے"

کے مصداق اس کی تکمیل ابھی امت کے ذمہ فرض ہے! (v) مشرکین عرب کے سوائے دنیا کی تمام اقوام کے لئے اسلام کا ابدی منشور یہ ہے کہ ایمان لے آئیں تو "للہ العزۃ و لرسولہ وللمومنین" (سورۂ منافقون: آیت ۷) میں یہ برابر کے حصے دار بن جائیں گے' بصورت دیگر خواہ یہودی رہیں' خواہ عیسائی' اور خواہ مجوسی رہیں خواہ ہندو لیکن دین حق کی بالادستی کو تسلیم اور قبول کریں اور جزیہ ادا کریں'--- تیسری صورت صرف جنگ کی ہے ---- چنانچہ یہ "ابدی منشور" بھی سورۂ توبہ ہی کی آیت ۲۹ میں مذکور ہے!

اب وہ ذرا ان امور پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا فرمالیں تو ہمارے اور ان کے مابین اختلاف کی خلیج بالکل ہی ختم ہوجائے گی کہ --- (i) سورۂ توبہ میں وارد ان دونوں آخری اعلانات سے میثاق مدینہ سمیت اس سے قبل کے جملہ معاہدات اور وثائق منسوخ اور کالعدم ہوگئے تھے--- اور (ii) اب جو فرض امت کے ذمے ہے اس کی ادائیگی کی واحد صورت یہ ہے کہ پھر کسی ملک میں از سر نو انقلابی جدوجہد کے ذریعے نام نہاد مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "حقیقی اسلامی حکومت" قائم کی جائے۔ (iii) اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس کے لئے اہم ترین اور اولین کام "دعوت" ہی کا ہے'--- اور خود اس کا حق وسیع پیمانے پر ادا کرنے کے لئے بھی "تنظیم" اور "تربیت" دونوں لازمی ہیں (iv) تنظیم کے لئے آپ "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کے الفاظ سے خواہ مخواہ الرجک نہ ہوں--- اس لئے کہ کم از کم ایک فرد نوع بشر نے تو یہ بیعت خود آپ کے ہاتھ پر بھی کی ہوئی ہے۔ ہماری مراد آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ سے ہے' جو "فالصالحات قانتات" کی قرآنی نص کے مطابق آپ کی "اطاعت فی المعروف" کی پابند ہیں' یہ دوسری بات ہے کہ وہ آپ کو دلیل یا اپیل سے اپنی رائے کا قائل کرلیں---- "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کے اصول پر قائم ہونے والے جماعت کی بھی حقیقی نوعیت اس سے زیادہ نہیں ہے! (v) رہے آگے کے مراحل تو خدارا مجھے ان کے ضمن میں اپنی بات مکمل کرلینے دیں' اس کے بعد بھی تمام گیندیں بھی موجود رہیں گی اور میدان بھی کہیں بھاگ نہیں جائے گا!

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

مرزا محمد منور کی معرکۃ الآراء کتاب سے ایک اقتباس

دیوار برہمن

پاکستانی نوجوانوں کو خبردار کرنے کی ایک کوشش

ہندو اور ہندو مت بالخصوص لالہ اور برہمن پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کا خاص موضوع ہے جس پر تحقیق کا انہوں نے حق ادا کیا اور اس کے نتائج کو پاکستانی مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے میں بھی بڑی محنت کی ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب "دیوار برہمن" منظر عام پر آئی ہے جسے مکتبہ وحدت ملی ' ۴۰ر بی اردو بازار لاہور نے شائع کیا اور قیمت ۱۹۰ر روپے رکھی ہے۔ کتاب سے ایک اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے جس سے اپنے موضوع پر مصنف کی گرفت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پروفیسر محمد منور صاحب نے پاکستانی نوجوانوں کو اس منفی جذبے سے روشناس کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے جو تحریک پاکستان کا ایک محرک تھا۔ ہمارے نوجوانوں کو تو سرحد پار سے محبت کا زمزمہ بہتا اپنی طرف آتا محسوس ہوتا ہے ' انہیں کیا خبر کہ اپنائیت کے اس اظہار کے پیچھے مسلم دشمنی کی کیسی ہولناک منصوبہ بندی چھپی ہوئی ہے۔ تاہم پروفیسر صاحب چونکہ علامہ اقبال کے فکر کے بھی سرکاری و غیر سرکاری وارث ہیں لہٰذا بجا طور پر توقع کی جانی چاہیے کہ وہ قیام پاکستان کے اس مثبت محرک کا شعور بھی عام کریں گے جو علامہ اقبال کا اصل ملی کارنامہ تھا۔ (مدیر)

برصغیر پاک و ہند میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے ' جن کا کوئی مرکزی عقیدہ نہ تھا۔ ان کے ملک (گنگا جمنا کا علاقہ ' نہ کہ سارا برعظیم) کا نام آریہ ورت تھا۔ اور یہ نام بھی آریاؤں کی آمد سے بعد کا ہے۔ بہر حال اس برعظیم میں بسنے والے کسی ایک مرکزی شخصیت کی سیرت سے محروم تھے ' توحید کے واضح تصور سے محروم تھے ' اور ان کی تقریباً ساری آبادی بت پرست تھی۔ کثرت کثیرہ اب بھی بت پرست ہے۔ اب سے تقریباً ایک سو سال پہلے " آریہ سماج" وجود میں آیا۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بت نہیں پوجتے مگر جیسا کہ پہلے عرض ہوا ' ہندوؤں کی بیشتر بلکہ حاوی آبادی بت پرست ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس وقت دوسرے کسی بڑے معاشرے میں نہ بتوں کی یہ فروانی ہے اور نہ بتوں کو اور ساتھ ہی جانوروں کو زندہ خدا جانا جاتا ہے اور نہ انہیں اس طرح والہانہ پوجا جاتا ہے۔ اگر کوئی انسانی گروہ کسی جنگل ' پہاڑ یا جزیرے میں آج سے پانچ ہزار سال قبل کی حالت میں بند کر جم کر اور منجمد ہو کر رہ گیا ہو تو یہ الگ بات ہے ورنہ دنیا کے دیگر تقریباً سارے بت پرست یا بت پسند معاشرے اب اپنے بتوں کو محض آثار قدیمہ جانتے ہیں اور انہیں اپنے کمال صنعت کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ مصر ' یونان ' روما ' ایران ' جاپان وغیرہ لیکن حیرت ہے کہ بھارتی ہندو معاشرے میں بت آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے ' وہ آج بھی دیوتا ہیں۔ یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ امر مد نظر رکھتے ہیں کہ ہندو معاشرہ تمدن و تہذیب کے دریائے رواں سے سیراب ہورہا ہے ' جس نے بڑے بڑے سائنس دان ' ماہرین ریاضیات اور عظیم فلاسفر پیدا کیے ہیں۔ ہندو معاشرہ بہت بڑا معاشرہ ہے اور چین کے بعد آبادی کی رو سے دنیا کا سب سے بڑا معاشرہ ہے ' مگر ذہنی طور پر یہ معاشرہ پانچ ہزار سال پرانا معاشرہ ہے۔ مراد ہے ذہناً" وہیں کھڑا ہے جہاں پانچ ہزار سال قبل تھا۔ ان کے ذہن و فکر نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا۔ علم کو بڑھتا رہا ' مگر علم ایک الگ شعبہ ہے اور عالی ظرفی ' شائستگی اور تمدن دوسرا شعبہ ہے۔ علم معلومات مہیا کرتا ہے ' علم تعمیر انسانیت کا فریضہ سرانجام نہیں دیتا۔ تعمیر انسانیت کا فرض بہترین انسان ہی ادا کرسکتے ہیں اور بہترین انسان ہر دور میں وہی تھے جو خدائی احکام و نواہی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اسلام کی کامل صورت ' اور خدائی احکام و نواہی پر استوار ' جمیل ترین صورت آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے ' اس لئے ہمارے عقیدے کی رو سے بہترین افراد وہ ہیں جو نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اچھے سے اچھا نمونہ ہوں ' مگر ہندو معاشرہ چونکہ توحید کے واضح تصور اور رسالت کے مفہوم ہی سے ناآگاہ ہے لہٰذا وہ بت پرستی اور حیوان پرستی سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتا۔ ایسے معاشرے میں کوئی سیرت مرکزی سیرت کیونکر بن سکتی ہے۔

یہی باعث ہے کہ کوئی خدا کو مانے جب بھی ہندو ' نہ مانے جب بھی ہندو۔ تناسخ کا قائل ہو جب بھی ہندو نہ ہو جب بھی ہندو ' بت پوجے جب بھی ہندو نہ پوجے جب بھی ہندو ' کرشن جی مہاراج کو پربھوجی کا اوتار تسلیم کرے جب بھی ہندو نہ کرے جب بھی ہندو ' غرض یہ معاشرہ جب سے وجود میں آیا ہے اس کے کوئی مقرر ضوابط نہیں ' یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی ہندو محقق بھی یہ فیصلہ نہیں کرپایا کہ ہندو کی تعریف کیا ہے ؟ ہندو کون ہے؟ اس ضمن میں پنڈت شوکشن کول کی کتاب "Wake up Hindus" کا مطالعہ کافی ہورہے گا۔ اس کتاب میں کول صاحب آخر میں فقط یہ کہہ سکے کہ ہندو وہ ہے جو برصغیر کے معاشرے سے نسبت رکھتا ہو ' اس کا نام اس معاشرے کے ناموں کا سا ہو اور اس معاشرے کے تمدن کے رنگ میں رنگا ہوا ہو ' یہاں کے میلے اور رسمیں

اس کے بھی میلے اور رسمیں ہوں۔

مشہور مغربی فلاسفر ہیگل نے اپنی کتاب "فلسفہ تاریخ" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ دنیا میں کوئی دوسرا معاشرہ اس طرح اپنے جغرافیے اور ماحول کا قیدی نہیں جس طرح ہندوستانی معاشرہ ہے۔ ہندوستان سے ہیگل کی مراد ہندو معاشرہ ہے ۔ یہی باعث ہے کہ البیرونی کے بقول (اور اس کا یہ قول اس کی کتاب "ما للھند" کے آغاز ہی میں وارد ہے) ہندوؤں کے نزدیک ان کے وطن کی سرزمین سے باہر کی ساری دنیا ناپاک ہے اور پاک دھرتی فقط انہی کا وطن ہے ۔ وہ غیر ملکیوں کو ملیچھ کہتے ہیں ' لیکن چونکہ ہر بیرونی سرزمین پلید ہے لہٰذا غیر ملکی اور ناپاک ہم معنی ہوگیا ۔ البیرونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندو لوگ اتنے برخود غلط ہیں کہ ان کے نزدیک جملہ علوم و فنون کا گھر انہی کا وطن ہے چنانچہ کسی علمی بحث میں اگر یہ کہا جائے کہ خراساں کے فلاں عالم نے یہ لکھا یا کہا ہے تو وہ حیرانی سے پوچھتے ہیں ہندوستان سے باہر کے لوگ یہ بات کیونکر جانتے ہیں----- وعلیٰ ہذا القیاس

مزید برآں یہ کہ ہندوؤں میں برہمن کی عنایت سے ذات پات کا رواج نہایت شدت سے رواج پذیر تھا ۔ ذات سے مراد طبقے تھے ۔ برہمن خدائی پرتو کی مالک بہترین انسانی ہستی تھے ۔ ان کے بعد کھشتری تھے ' ان کے بعد ویش اور پھر بیچارے شودر۔ تمام عقائدی امور کے تحویل دار برہمن تھے ۔ وہ اصول اپنے مفاد کے مطابق اختراع کرتے اور اسے دھرم کا حصہ بنادیتے ۔ وہ راجوں مہاراجوں کی تاجپوشی اور خوشی اور غم کی جملہ رسوم کے متولی تھے ۔ کھشتری حکمرانی کے ذمہ دار تھے۔ نظم ملک داری ان کے سپرد تھا۔ اس ضمن میں بھی برہمن نے یہ اختیار اپنے پاس رکھا ہوا تھا کہ جس گروہ یا جماعت یا قبیلے کو چاہتے ' اپنے مفاد کی خاطر کھشتری قرار دے دیتے۔ (سیوا جی کو کروڑوں روپے رشوت لے کر راجپوت قرار دیا اور اس طرح کھشتری بنا کے اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی) ویش لوگ تجارت اور کھیتی باڑی کا کام کرتے جبکہ شودر تمامتر نیچ تھے کہ انہیں باقی تینوں بڑے طبقوں کی خاطر ہر چھوٹی سے چھوٹی خدمت بجا لانا پڑتی تھی ۔ بڑھئی وہ تھا ' جو لاہا وہ تھا ' لوہار وہ تھا ' گندگی صاف کرنے والا وہ تھا ' اس کا انسانی درجہ اتنا گھٹیا تھا کہ وہ ویدوں کے پوتر کلمات تک نہ زبان سے ادا کرسکتا تھا اور نہ سن ہی سکتا تھا ۔ اگر وہ سنتا ہوا پایا جاتا تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کے ڈال دیا جاتا اور اگر اس کی زبان سے ویدوں کے الفاظ ادا ہوتے سن لیے جاتے تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی--

مطلب یہ ہے کہ جسے وہ ذات پات کہتے ہیں ' درحقیقت وہ مختلف طبقے اور گروہ ہیں ' مگر یہ چار طبقے آریائی طبقے تھے ' شودر سمیت ' ایک طبقہ اور بھی تھا ' وہ جملہ غیر آریائی قبائل کا طبقہ تھا جو سرے سے انسانی حقوق کے مالک نہ تھے۔ وہ غیر آریائی ہونے کے باعث چنڈال تھے ۔ راکھش تھے اور نہ جانے کیا کیا ۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اچھوت کہلاتے ہیں یعنی ان کا چھو جانا بلکہ ان کے سائے کا چھو جانا بھی آریائی نسل کے شخص یعنی " جاتی کے پوت" کو بھرشٹ (پلید) کردیتا ہے ۔ ان بدبخت کروڑوں انسانوں میں وہ لاکھوں افراد بھی ہیں جو اچھوت سے بھی بدتر ہیں ۔ وہ ادیکھ (Unseeables) کہلاتے ہیں یعنی یہ وہ افراد ہیں کہ ان کی نظر بھی اگر آریہ نسل کے کسی شخص پر پڑ جائے تو وہ بھرشٹ ہوجاتا ہے ۔ لہٰذا یہ لوگ جنگلوں ' پہاڑوں اور دور دراز کے بے آباد مقامات پر آباد رہتے ہیں۔

اس ضمن میں سوامی دھرم تیرتھ مہاراج کی کتاب the Menace of Hindu Imperialism کا مطالعہ کافی ہو رہے گا ۔ اگر کوئی اور کتاب دیکھنے کی فرصت ہو تو وہ نراد سی چودھری کی The Continent of Circee (سرسی کا جزیرہ جادو) ہے---- یہ دونوں حضرات خود ہندو مذہب کے پیرو ہیں اور ہندوؤں کے خونخوار آداب حیات و نظریات سے نالاں ہیں۔

نراد چودھری نے اپنی اس کتاب میں ایک بات یہ بھی تحریر کی ہے کہ ہندو قوم کے مزاج کا یہ پہلو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہر دم تشویش اور گھبراہٹ میں کیوں مبتلا رہتی ہے ۔ مثلاً ہندوؤں کو یہ اضطراب لاحق رہتا ہے کہ فلاں اور فلاں ہمسایہ ملک سے ہمیں فوراً نبٹ لینا چاہیے ۔ اگر ہم اس کو دبا نہیں لیتے تو یقیناً وہ ہمیں دبا لے گا--- اس طرح نراد چودھری نے یہ بھی رقم کیا ہے کہ ہمسائے سے ہٹ کر خود ان کے اپنے معاشرے کے اندر بھی اگر کوئی ایسی قوم یا قبائل کی جمعیت موجود ہو جو ان کے اوضاع و اطوار اور آداب و رسوم پر کاربند نہ ہو تو اس کے ضمن میں بھی کھٹکتے رہتے ہیں ' چاہیں گے کہ ایسی جمعیتوں یا قبیلوں کی سرکوبی کردیں ورنہ وہ لوگ ان کی سرکوبی لازماً کردیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہندو کسی کے ساتھ نیک ہمسائے کی طرح یا مل جل کر رہ ہی نہیں سکتے ۔ ایسی گھبرائی اور خوفزدہ (Panicky) قوم کے ساتھ بقائے باہم (Coexistence) کس طرح ممکن ہوسکتی ہے جو ہر دم اس چکر میں رہے کہ مار ڈالو ' ورنہ مارے جاؤ گے--- نراد چودھری نے مزید یہ لکھا ہے کہ ایسی نفسیاتی کیفیت میں رہنے والی قوم لازماً خونخوار ہوتی ہے اور یہ خونخواری اس کی بزدلی کی پیداوار ہوتی ہے۔

کہتی ہے خاک بوسنیا

کہتی ہے خاک بوسنیا' مشرق کی ہوا! مشرق کی ہوا!
وہ لوگ کہیں دیکھے تم نے جو مرد ' مجاہد غازی تھے
جو لا الٰہ کے پالے تھے ' سرتاپا—— سر کی بازی تھے
لا دینا کچھ تو ان کی خبر ' جو نعروں دعووں والے تھے
اور بیشک حق و ایماں کے بالا و بلند حوالے تھے

جناب کفایت محی الدین کی خوبصورت نظم کے ساتھ ہمارے ہاتھوں ایک زیادتی ہوئی ۔ ان کے ایک بند کا ایک مصرعہ شائع ہونے سے رہ گیا ۔ اس غلطی کے کفارے میں ہم وہ پورا بند دوبارہ اسی شکل میں شائع کررہے ہیں ۔ (مدیر)

بلا سود بینکاری کا متبادل نظام ـــــ ایک تحقیقی جائزہ

بلا سود بینکوں اور مالیاتی اداروں کی کارکردگی کا فسوں

علامہ طاہر القادری کے پیش کردہ حل چربے ہیں
اور متعدد کاوشوں کا اجر اپنے نام کرانے کی ایک ناکام کوشش

طاہر القادری صاحب کے اولین رفقائے کار میں سے محمد خلیل الرحمٰن قادری کی تحریر خاص برائے "ندائے خلافت"

بلاسود بنکاری کا آغاز بلاشبہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جس کے دل میں رتی بھر بھی ایمان موجود ہے لیکن ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ پاکستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی حالات کے پس منظر میں ابھی تک کوئی ایسا قابل عمل نظام میسر نہیں آسکا جس کی تنفیذ و ترویج سے نظام بنکاری کو عملاً سود سے پاک بھی کیا جاسکے اور اس مالیاتی نظام کے عملی فوائد سے استفادہ کیا جاسکے۔ بلا سود بنکاری کے لئے متعدد خاکے پیش کئے گئے ہیں جن میں مضاربت اور مشارکت نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں بلکہ اگر معاشرے میں عدل ' تقویٰ اور دیانت جیسی اعلیٰ اقدار کا سکہ رواں ہو تو انہیں بلا تامل سود کی کامیاب متبادل اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ہم پاکستان میں بلا سود بنکاری کا سوچتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف سود کی متبادل اساس فراہم کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ اس متبادل اساس کو ہم نے ایک ایسے معاشرے میں استعمال کرنا ہے جہاں تقویٰ اور امانت و دیانت کے تصورات عملاً" ناپید ہوچکے ہیں ' جہاں سیلاب جیسی ناگہانی آفت کی ہلاکت خیزیاں بھی انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں ناکام رہتی ہیں۔ اس معاشرے کے کچھ لوگ سیلاب کی بپھری ہوئی لہروں کی نذر ہو رہے ہیں تو کچھ امدادی کاموں کی بجائے ان کے وہ بازو کاٹنے میں مصروف ہیں جن سے گھڑیاں اور طلائی زیورات آسانی سے اتارے نہیں جاسکتے۔

اگر مسئلہ صرف سود کی متبادل اساس فراہم کرنے کا ہوتا تو اسے ملت اسلامیہ کے کئی درد مند حضرات حل کرچکے ہیں۔ پاکستان میں مضاربت اور مشارکت پر مبنی بلا سود بنکاری کا جامع ماڈل پروفیسر نجات اللہ صدیقی پیش کرچکے ہیں۔ لیکن جب ہم مضاربت اور مشارکت کو پاکستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی ماحول کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو خوف آنے لگتا ہے۔ انہی خدشات کا اظہار خود وفاقی شرعی عدالت نے بھی حسب ذیل الفاظ میں اپنے فیصلے میں کیا ہے:

> "اس امر کا حقیقی اور سنگین احتمال موجود ہے کہ نفع و نقصان میں شراکت کو اس کی موجودہ صورت حال میں غلط طریقے سے استعمال کیا جاتا رہے گا جو سود کی بنیاد پر لین دین کرنے کے لئے چور دروازہ کھولنے کا سبب بن جائے گا۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ بنکاری اور مالیاتی نظام سے سود کا خاتمہ اصولی طور پر ایک جری اقدام ہے۔ ابتدائی دور میں مسائل و مشکلات کا سر اٹھانا لازمی ہے"

یہی وجہ ہے کہ بلا سود بنکاری کے حوالے سے ہماری جدوجہد کا مرکز و محور صرف یہی نہیں رہا کہ ہم سود کی متبادل اساس کی نشاندہی کردیں بلکہ ہمارے علماء ' دانشور ' ماہرین اقتصادیات اور بنکاروں کی فکر اس سمت بھی ارتقاء پذیر رہی ہے کہ بلا سود بنکاری کے لئے ایسی اساس فراہم کی جاسکے جو پاکستان کے مخصوص معاشی و سماجی حالات میں بھی قابل عمل ہو۔

سود کی متبادل اساس فراہم کرنے کے حوالے سے یہ اضافی شرط ہی دراصل ہمارا اصل مسئلہ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام نے سودی بنکاری کا کوئی متبادل نظام فراہم نہیں کیا بہت بڑا مغالطہ بلکہ علمی بددیانتی ہے جس کا ارتکاب خواہ کوئی حکومت کا نمائندہ کرے یا کوئی نام نہاد دانشور' بہرحال قابل افسوس اور سزاوار مذمت ہے۔

آج اگر اعلیٰ اخلاقی اور سماجی اقدار کے حامل معاشروں کے لئے اسلام نے بلا سود بنکاری کا قابل عمل خاکہ پیش کردیا ہے تو کل ہمارے جیسے گئے گذرے معاشرے کے لئے بھی اس کی کوئی ٹھوس عملی صورت یقیناً سامنے آجائیگی۔ بس ہماری سوچ یہ ہونی چاہیے کہ ہم مل جل کر اور ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے بلا سود بنکاری کا وہ نظام تلاش کریں جو قرآن و سنت کے تابع ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے مخصوص معاشرتی ڈھانچے میں قابل عمل بھی ہو۔ ثانیاً ہم معاشرے میں اخلاقی اقدار کی بحالی کی جنگ لڑیں تاکہ وہ معاشرہ تشکیل دیا جاسکے جو قرآن کا مقصود و مطلوب ہے کیونکہ اسلام کی فصل صرف اس زمین پر پھل پھول سکتی ہے جسے ایمان کا بیج ڈالنے سے قبل خوب اچھی طرح تیار کرلیا گیا ہو۔

اگر ہماری دینی تحریکیں اس حقیقت سے صرف نظر کئے رکھیں گی تو ایک نظام بنکاری کیا ' اسلام کا کوئی نظام بھی وہ برکات و ثمرات نہیں لاسکے گا جس کا مشاہدہ اسلام کے غلبے اور تمکنت کے دور میں چشم فلک نے کیا ہے۔ پھر ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ آج ہم نظری بحثوں میں الجھ

کر اپنی توانائیاں برباد کررہے ہیں لیکن سود کے متبادل نظام کی تیاری کے حوالے سے ٹھوس اقدام کرنے کو تیار نہیں ۔ علمی انحطاط اور فکری بانجھ پن کے اس دور میں اگر کوئی سنجیدگی کیساتھ بلا سود بنکاری کے لئے عملی نظام کی بات کرے تو امید کے سوکھے دھانوں میں ایک دفعہ ضرور پانی پڑ جاتا ہے۔

ایسا ہی ماجرا چند روز قبل ہوا جب ملک کے معروف عالم دین علامہ طاہر القادری نے بلا سود بنکاری کے حوالے سے قابل عمل خاکہ پیش کرنے کا اعلان کیا۔ اس سے قطع نظر کہ انہوں نے یہ خاکہ کس انداز ' کس پس منظر اور پیش منظر میں بیان کیا ' ہم نے محض اس خاکہ کے قابل عمل ہونے کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے ۔ امید ہے کہ علامہ صاحب اور ان کے حواری اس تجزیے کو اسی انداز میں لیں گے کیونکہ ہم نے یہ تجزیہ علامہ صاحب کے وہم کے مطابق حکومت کے ایماء پر نہیں کیا ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر وہ علمی اعتراضات کا علمی زبان میں جواب دیں گے۔ (انہوں نے فرمایا کہ اب میرے خاکے پر اعتراضات ہونگے اور جو لوگ اعتراضات وارد کریں گے وہ حکومت کے خریدے ہوئے ہونگے)۔ ایک عالم کی طرف سے اس طرح کے بے بنیاد الزام اور سوئے ظن ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تاہم جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ ۔

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

اس تمہید کے ساتھ موصوف کے خاکے کا تجزیہ نذر قارئین ہے

بلا سود بنکاری کے سو ادارے

علامہ موصوف نے فرمایا ہے کہ اس وقت دنیا میں ۱۰۰ بنکوں اور مالیاتی اداروں میں بلا سود بنکاری کا نظام کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ انہوں نے ان ممالک اور اداروں کی فہرست بھی مہیا کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے اس فہرست میں پاکستان کو بھی شامل کردیا ہے بلکہ ان اداروں میں پاکستان کے چار اداروں کو بھی جگہ دی ہے اور بنک کے پی ایل ایس نظام کو آخری ادارہ قرار دیا ہے۔ اسی سے وہ اپنے اعداد و شمار کی ثقاہت کا اندازہ خود ہی فرمالیں۔

وہ پاکستان جس میں بلا سود بنکاری کے نظام کو رائج کرنے کے لئے انہوں نے اسقدر اہتمام فرمایا' ان کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق بلا سود بنکاری کا نظام پہلے ہی کامیابی سے چل رہا ہے تو اہل علم سمجھ لیں گے کہ ان کے فراہم کردہ اعداد و شمار میں باقی ۹۶ اداروں کی اکثریت میں بھی صورت حال کم و بیش یہی ہوگی۔

۱۴ر نومبر ۱۹۹۱ء سے قبل جب تک وفاقی شرعی عدالت نے مروجہ نظام بنکاری کو سود ہی کی ایک شکل قرار نہیں دیا تھا ' دنیا کے طول و عرض میں ہمارے نظام بنکاری کو سود سے پاک ہی تصور کیا جاتا تھا۔ اگر ہم آٹھ دس سال تک اپنے سودی نظام کو بلا سودی ثابت کرسکتے ہیں تو دیگر ممالک میں بلاسود بنکاری کے دعویداروں کیلئے ایسا کیوں ممکن نہیں۔ ثانیا ان اداروں میں بلاسود بنکاری کے کون سے طریق رائج ہیں' کیا وہ شرعا درست بھی ہیں کہ نہیں؟۔ ثالثا ان کے طریق کار کا اطلاق پاکستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کے پیش نظر قابل عمل بھی ہے کہ نہیں۔ ان تمام باتوں کا ٹھوس اور مدلل جواب دئے بغیر بلا سود بنکاری کی دلیل کے طور پر سو اداروں کا نام پیش کر دینا ایک مغالطے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

قرض حسنہ ڈپازٹ اور قرض حسنہ سکیم

۲۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ " قرض حسنہ ڈپازٹ اکاؤنٹ کھولے جائیں جس میں لوگ نفع ونقصان میں شریک ہوئے بغیر اپنی رقوم جمع کرائیں۔ یہ رقوم کھاتہ داروں کی طرف سے بنک کو بلاسود قرض تصور کی جائیں گی"۔ قرض حسنہ ایک بہت بڑی معاشرتی بھلائی اور خدمت ہے لیکن معاشرہ کے مستحق افراد کا حق ہوتا ہے۔ موصوف کس بنیاد پر معاشرے کے مستحق کو نظر انداز کر کے قوم کے قرض حسنہ کا رخ بنکوں کی طرف موڑنا چاہتے ہیں جو کہ مالیاتی اور تجارتی ادارے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ بھی تجویز فرما رہے ہیں کہ قرض حسنہ ڈپازٹ کی ترغیب کیلئے بنک وقتا فوقتا کھاتہ داروں کو غیر معینہ بونس انعامات دیں۔ گویا بنک قرض حسنہ کے نام پر عوام کا کڑوڑوں روپیہ وصول کریں اور اس سے لاکھوں روپیہ کما کر چند ہزار روپے کے انعامات کھاتہ داروں میں تقسیم کردیں اور رہا سہا انعامی سکیموں کا وہ سلسلہ پھر سے شروع کردیں جس سے قوم نے حال ہی میں نجات حاصل کی ہے۔

اگر جوابا وہ یہ موقف اختیار فرمائیں کہ بنک یہ قرض حسنہ ڈپازٹ صرف معاشرے کے مستحق افراد کو قرض حسنہ جاری کرنے کیلئے وصول کریں تو اس موقف میں بھی کئی مغالطے پنہاں ہیں۔ اولا یہ کہ بنک مالیاتی اور تجارتی ادارہ ہے' کوئی سماجی بہبود کی تنظیم نہیں جسے یہ حق دیا جائے کہ وہ عوام کا سرمایہ مستحق افراد میں تقسیم کرتا رہے۔ اس کام کیلئے حکومت نے زکوۃ فنڈ اور بیت المال قائم کر رکھا ہے۔ بنکوں کو یہ ذمہ داری سونپنے کی بجائے ہم بیت المال اور زکوۃ فنڈ کے نظام کو بہتر اور موثر بنا کر اس ذمہ داری کی تکمیل کا سامان کر سکتے ہیں۔ ثانیا بنک کیلئے اس کام کی انجام دہی میں کیا کشش ہے کہ وہ ایک طرف قرض حسنہ ڈپازٹ میں رقوم کی وصولی حسابات اور آڈٹ وغیرہ کیلئے انتظامی اخراجات برداشت کرے اور دوسری طرف قرضہ حسنہ کے اجراء اور واپسی تک انتظامی اخراجات الگ برداشت کرے اور ان قرضوں کی واپسی میں موجود RISK الگ لے۔ پھر خدانخواستہ اگر یہ قرض ڈوب جائیں (جن کا قوی امکان ہے) تو قرض خواہ کو نقصان کا ازالہ الگ کرے۔

ثالثا ہمارے معاشرے کے جن افراد کو قرض حسنہ کی افادیت اور اجروثواب کا صحیح اندازہ ہے اور وہ قرض حسنہ کی مالی استعداد بھی رکھتے ہیں' وہ ہرگز یہ نہیں پسند کریں گے کہ قرض حسنہ کی ادائیگی کیلئے بنک کو اپنا ایجنٹ مقرر کریں۔ وہ یہ کارخیر خود بہتر سے بہتر انداز میں انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے قبل نظام زکوۃ کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ لوگ بنکوں کے ذریعے زکوۃ کی کٹوتی پر کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ چنانچہ کبھی انہوں نے مسلکی بنیادوں پر اور کبھی یکم رمضان کو اپنے بقایاجات کرنٹ اکاؤنٹس میں منتقل کروا کر فرار کی راہیں تلاش کی ہیں حالانکہ یہ کٹوتی عملا ان کے اصل زر سے نہیں بلکہ منافع سے ہوتی ہے۔ ان میں بیشتر حضرات کو زکوۃ کی ادائیگی پر اعتراض نہیں بلکہ ان کا اطمینان اس میں ہے کہ وہ فریضہ اپنے ہاتھوں سے معاشرے کے مستحق افراد کی مدد کی صورت میں ادا کرنا چاہتے ہیں۔

رابعا ہمارے ہاں ہر معاملے کو

INSTITUTIONALIZE کرنے کا تصور فروغ پذیر ہے۔ اس پر بھی نظرثانی کی ضرورت ہے۔ جب قرض حسنہ وغیرہ معاشرے کا ایک فرد دوسرے فرد کو براہ راست دیتا ہے تو اس سے باہم مودت' ہمدردی اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوتی ہے' طبقاتی کشمکش کا ازالہ ہوتا ہے اور معاشرہ من حیث المجموع وحدت اور یکجہتی کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اسکے برعکس اگر اس کار خیر کو INSTITUTIONALIZE کرلیا جائے تو یہ ایک بے روح عمل بن جائے گا۔ دینے والے کا لینے والے سے کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ دینے والا اسے جبر سمجھے گا اور کبھی بھی اسکے مصارف کے حوالے سے مطمئن نہیں ہوگا جبکہ لینے والے کی عزت نفس الگ مجروح ہوگی۔

بچت کھاتے

۳۔ موصوف نے اپنے خاکے میں سیونگ کھاتوں کا تصور ہی ختم کر دیا ہے حالانکہ بنک ڈپازٹس کا معتدبہ حصہ سیونگ اکاؤنٹس سے میسر آتا ہے۔ سیونگ اکاؤنٹ غریب اور متوسط آدمی کا اکاؤنٹ ہوتا ہے جس میں وہ حسب ضرورت لین دین بھی کرتا رہتا ہے اور اصل زر پر اضافہ بھی حاصل کرتا ہے۔ موصوف اپنے نظام میں ان افراد کیلئے تو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جن کے پاس سرمائے کی فراوانی ہے اور جو اپنی رقوم بنک میں جمع کرا کر میٹھی نیند سو سکتے ہیں لیکن نجانے کیوں اس غریب اور متوسط طبقہ کو جس کے ساتھ ہمدردی کے وہ ہمیشہ دعویدار رہے ہیں' بلاسود بنکاری سے متمتع ہونے کے تمام مواقع سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

قرضہ جات

۴۔ موصوف نے قرضہ جات کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ بنک کی آمدنی کا ذریعہ نہیں رہیں گے بلکہ حاجت مند افراد کی معاشی بہبود کا ذریعہ بن جائیں گے۔ انہوں نے دریں سلسلہ قرضہ کی تین صورتیں تجویز کی ہیں۔ (۱) قرض حسنہ۔ (۲) قرض عام۔ (۳) قرض تقابل۔

اول الذکر قسم یعنی قرض حسنہ کے بارے میں ہمارا نقطہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ قرض عام کا دائرہ انہوں نے ملازمین کی ضروریات سے لیکر زرعی قرضہ جات تک پھیلا دیا ہے جس میں پیداواری اور ترقیاتی قرضہ جات دونوں شامل ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ قرضہ جات بلاسود ہونگے البتہ قرض دار سے حق الخدمت وصول کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہماری آرا حسب ذیل ہیں۔

(الف)۔ موصوف ایک طرف تو یہ فرما رہے ہیں کہ انکے مجوزہ نظام میں قرضے صرف ضرورت مند افراد کی معاشی بہبود پر خرچ ہونگے دوسری طرف قرض عام کا اطلاق ٹریکٹر کی خریداری پر بھی فرما رہے ہیں بلکہ جملہ زرعی قرضہ جات کو قرض عام کے تحت تصور کر رہے ہیں۔ کیا ٹریکٹر کا خریدار کوئی ضرورت مند اور حاجت مند شخص ہے جسے آپ معاشرے کے دیگر طبقات سے ممیز کر کے یہ سہولت عنایت کرنا چاہتے ہیں؟۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ زرعی قرضے چھوٹے قرضے ہوں یا ترقیاتی قرضے' سب کے سب پیداواری نوعیت کے ہیں۔ اسلئے انہیں بھی دیگر کاروباری اور پیداواری قرضہ جات کی طرح چلانا چاہئے۔ جہاں تک سروس چارجز کا تعلق ہے' موصوف نے اسے مستقل ذریعہ تمویل کے طور پر بھی پیش کیا ہے اور انکے تعین کیلئے بھی نقل کیا ہے۔ پیش کردہ فارمولا کے مطابق سروس چارجز کے تعین میں غلطی کے کئی امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہو گا کہ سروس چارجز کے تعین کے حوالے سے اثاثہ جاتی اخراجات CAPITAL EXPENSES اور صرفی اخراجات REVENUE EXPENSES کا فرق کرنا ہوگا۔

(ب)۔ بنک کے وہ اخراجات بھی حق الخدمت کی شرح کے تعین میں شامل نہیں کئے جا سکتے جن کے عوض بنک نے کسی صورت میں بھی معاوضہ وصول کرلیا ہے یعنی ڈی ڈی' ٹی ٹی اور ایم ٹی وغیرہ کا اجراء۔ دوسرے بنکوں اور شہروں سے چیکوں وغیرہ کی رقوم منگوانا اور اسی طرح فارن ایکسچینج کاؤنٹر پر دی جانے والے Non-fund based services بھی اسی زمرے میں آئیں گی۔

(ج)۔ اثاثہ جات کی قیمتوں میں اضافہ اور فرسودگی کے حوالے سے مروجہ manipulation بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔

(د)۔ جس دورانئے کیلئے حق الخدمت کا تعین کیا جا رہا ہو' اس دورانئے میں پہلے سے ادا شدہ اخراجات (Pre-paid Expenses) اور مستقبل میں ادا کئے جانیوالے اخراجات (Expenses to be paid) کو بھی ملحوظ رکھنا ہو گا۔

قرض متقابل

قرضوں کی تیسری قسم بنیادی طور پر شیخ محمود احمد (مرحوم) کی تجویز ہے جسے بے حد سراہا بھی گیا لیکن یہ بات بڑی واضح ہے کہ یہ چھوٹی مدت کے قرضوں کیلئے قابل عمل ہے۔ بالعموم اسکا اطلاق چالو سرمائے (WORKING CAPITAL) کیلئے حاصل کئے جانے والے قرضے پر کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت باقی رہتی ہے' یہ کہ بعض علماء کے نزدیک یہ تصور جائز نہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس قرض سے قرض خواہ کو کسی بھی صورت میں منافع ملے' وہ ربا ہے۔ اسلئے ایڈوائزری کونسل کے تین ممتاز ممبران نے اس پر اعتراض کیا تھا۔

ذرائع تمویل

علامہ موصوف نے ذرائع تمویل کے حوالے سے جن ذرائع کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک ذریعہ بھی نیا نہیں بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں درج ہے اور اس پر خاصی لے دے بھی ہو چکی ہے۔ ہم یہاں مختصرا ہر ذریعہ تمویل کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ مشارکہ اور مضاربہ

یہ تجویزیں اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں پیش کیں۔ ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ تجاویز بھلا کیونکر قابل عمل ہو سکتی ہیں جبکہ ہر کہیں قرضے معاف کروانے کا رجحان ہے۔ حال ہی میں وزیراعظم نے ٹرانسپورٹ سکیم کے تحت ٹیکسیاں دیں۔ یار لوگوں نے وہ ٹیکسیاں کابل پہنچا دیں اور چوری کی FIR درج کرا کے انشورنس کمپنی میں کلیم داخل کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انشورنس کمپنیوں نے اس سکیم کے تحت ٹرانسپورٹ کی انشورنس کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے انسٹالمنٹ کی سہولت دی۔ یار لوگوں نے جعلی کارڈ بنوائے اور کنکشن حاصل کر کے عوام میں اندرون اور بیرون ملک کالوں کی لوٹ سیل لگا دی۔ چونکہ تین ماہ تک اس کنکشن کا بل نہیں آتا اسلئے تین ماہ تک ہزارہا روپے کما کر فارغ ہو گئے اور جب بل کی ادائیگی کا وقت آیا تو صارف کا سراغ ہی نہ مل سکا۔ اگر بنک مضاربت اور مشارکت پر رقم مہیا کر دیتا ہے تو اس طرح کی

لوٹ کھسوٹ کے ماہرین سال دو سال بعد اپنے اپنے کاروبار کے ایسے سنگین نتائج بتائیں گے کہ کئی مینیجروں کو دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

۲۔ بیع موجل

بیع موجل (Mark Up) کا حیلہ بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے ہی ڈرتے ڈرتے پیش کیا تھا اور سفارش کی تھی کہ اس کا بے محابا استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن ارباب بست وکشاد نے پورے نظام بنکاری کی بنیاد ہی اس حیلے پر رکھدی جسکا نتیجہ یہ نکلا کر وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں دو ٹوک لکھ دیا ہے کہ:

"مارک اپ سسٹم جیسا کہ وہ مروج ہے' احکام اسلام کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔ نیز لفظ "مارک اپ" کو قانون دستاویزات قابل بیع وشری ۱۸۸۱ دفعات ۷۹' ۸۰ سے حذف کر دیا جائے۔"

موصوف حکومت پر تو یہ طعن کر رہے ہیں کہ اس نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو چیلنج کر دیا ہے لیکن بیع موجل کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے بعد بیع موجل پر موصوف کا اصرار کیا وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف عملاً چیلنج کے درجے میں نہیں آتا؟۔

۳۔ اجارہ پٹہ داری

یہ ذریعہ تمویل بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا تھا جسکی دونوں اقسام انہوں نے من وعن نقل کر دی ہیں لیکن اگر بنظرغائر دیکھا جائے تو یہ تکنیک بھی ایک حیلہ ہی ہے بلکہ درج ذیل وجوہ کی بناء پر اس میں شریعت کے قانون اجارہ کی صحیح تطبیق بھی نہیں۔

(۱) ہر قسم کی چیز کو کرایہ پر دینا شرعاً درست نہیں۔ کتاب الفقہ میں فقہ حنفیہ کی رو سے کرایہ کے جواز کی صرف درج ذیل پانچ صورتیں بیان کی گئی ہیں:

☆ مکانات اور دکانیں۔

☆ زرعی کھیتی باڑی کیلئے اراضی' تعمیر مکان یا شجرکاری کیلئے سفید زمین۔

☆ باربرداری یا کاشت کاری کیلئے حیوانات اونٹ وگھوڑے' خچر' گدھے' گائے اور سواری۔

☆ خدمت گاری' سامان اٹھانے یا صنعت کاری کیلئے آدمی' درزی' اور لوہار وغیرہ۔

☆ کپڑے' خیمہ اور زیور وغیرہ۔

متذکرہ بالا پانچوں صورتوں میں مشینری کی کرایہ داری کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ گویا جس طرح زمین کا کرایہ لینا فقہا کے نزدیک ایک اختلافی مسئلہ ہے اسی طرح مشینری کی کرایہ داری بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

(۲)۔ پٹہ داری کی صورت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں کرائے کو ربا کا حیلہ بنایا جا رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کرنسی نوٹوں کو کرائے پر چڑھانا نامعقول اور مضحکہ خیز بات ہے۔ اسلئے سرمائے پر سود حاصل کرنے کیلئے کرنسی نوٹوں کی بجائے مشینری پر اسی تناسب سے کرایہ حاصل کرنے کو حیلہ بنایا جا رہا ہے۔ بلکہ کرائے کا تعین کرتے ہوئے سود کے عنصر کے علاوہ مشینری کی فرسودگی کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کتاب الفقہ میں کرایہ کو ربا کا حیلہ بنانے کی واضح ممانعت کا بیان ملتا ہے۔

"پس اگر زید نے عمر سے کوئی مکان لیا جس کا کرایہ دس ہے تو وہ دس پر یا اس سے زیادہ یا کم پر دوسرے کو دے سکتا ہے بشرطیکہ اس کو ربا کیلئے حیلہ نہ بنایا جائے۔"

(۳)۔ یہ تکنیک سود کے ساتھ متشبہ ہے۔ سود میں بھی راس المال پر معین اضافے کا عنصر شامل ہوتا ہے اور اس صورت میں بھی راس المال پر معین اضافے کا عنصر شامل ہے کیونکہ مشینری کی فرسودگی کا بار پٹہ دار پر ہوتا ہے۔ سود میں بھی نفع میں شرکت ہوتی ہے جبکہ نقصان کی ذمہ داری صرف قرض دار کی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح پٹہ داری میں بھی بنک کسی قسم کے نقصان سے بری الذمہ ہوتا ہے۔ سود کے ساتھ اس تکنیک کا اشتباہ یہ تقاضہ کرتا ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ "پس تم ربا کو چھوڑ دو اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو"۔ ڈاکٹر محمد رواس نے حضرت عمرؓ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب موسوعہ فقہ عمر میں لکھا ہے کہ لفظ "ریبہ" جو حضرت عمرؓ نے ربا کے ساتھ فرمایا "ریب" سے مشتق ہے۔ اس کے معنی شک وشبہ کے ہیں اور یہاں اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اسکی حلت کی بابت ذہن میں شک وشبہ پیدا کرے۔ اسلئے حضرت عمرؓ ربا کے بارے میں انتہائی محتاط تھے اور اکثر فرماتے تھے کہ ہم نے ربا کے خوف سے نو دس حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

(۴)۔ اگر کرائے پر دئے گئے اثاثہ کی مانگ بوجوہ کم ہو جائے تو اسکا گرنے کا اندیشہ بہرصورت موجود رہتا ہے جبکہ اس صورت میں بنک کو اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ پٹہ داری کے معاہدہ کی مدت کے دوران اگر مشینری کی مانگ بوجوہ ختم بھی ہو جائے تو پٹہ دار بنک کو معینہ کرایہ ادا کرتا رہے گا۔

(۵)۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ کسی بھی اثاثہ کی فرسودگی کے ساتھ ساتھ اسکے کرائے میں کمی واقع ہونی چاہئے لیکن اس صورت میں پٹہ دار معاہدہ کے آغاز سے لے کر انجام تک معینہ شرح کے ساتھ کرایہ ادا کرتا رہتا ہے۔

(۶)۔ عام اثاثہ جات کی صورت میں مالک یہ خطرہ بھی مول لیتا ہے کہ کبھی کبھار کچھ عرصہ کیلئے اسکا اثاثہ کرایہ پر نہیں چڑھتا۔ لیکن اس صورت میں بنک کو اس قسم کا کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس ذریعہ تمویل میں درج ذیل فنی قباحتیں بھی موجود ہیں۔

الف۔ یہ ذریعہ تمویل مروج سود سے بھی کہیں زیادہ استحصالی ہے۔ اس میں بنک کو مشینری کی خریداری پر خرچ کی گئی رقم کے علاوہ معقول منافع معاہدہ ختم ہونے تک مل جاتا ہے جبکہ معاہدہ ختم ہونے پر اصل اثاثہ بھی بنک کے پاس رہتا ہے۔ بنک اسے اسکی استعداد کے پیش نظر دوبارہ کرائے پر دے سکتا ہے یا فروخت بھی کر سکتا ہے۔ یعنی اسی صورت میں بنک کو اصل زر لوٹانے کے باوجود بھی پٹہ دار مشینری کی ملکیت سے محروم رہتا ہے۔ اگر معاہدہ کی رو سے پٹہ دار مشینری کو خریدنے کا مجاز بھی ہو تو اسے دوہرا جرمانہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پہلے وہ معاہدہ کے اختتام تک ہر ماہ منافع اور فرسودگی پر مشتمل جرمانہ ادا کرتا ہے پھر مشینری کی خریداری پر صرف کیا اصل زر بنک کو لوٹاتا ہے اور یوں مشینری اس کو ملتی ہے۔ معاہدہ کے اختتام پر فرسودگی کے بعد اسکی مالیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مشینری کی انشورنس کے اخراجات بھی پٹہ دار کو برداشت کرنے پڑتے ہیں حالانکہ مشینری کا مالک معاہدہ کے اختتام تک بہرصورت بنک ہی رہتا ہے۔

ب۔ اس ذریعہ تمویل کے ذریعے بنک صرف محدود قسم کے قرضے جاری کر سکتا ہے۔ اس سے

صنعتی قرضوں میں صرف مشینری کی خریداری کی حد تک قرضوں کا اجراء ممکن العمل ہے۔ جبکہ قرضوں کا دیگر بیسیوں صورتوں پر اس ذریعہ تمویل کا اطلاق سرے سے ممکن نہیں۔ صنعتی قرضوں میں عمارت اور چالو سرمائے کیلئے فراہم کئے جانے والے قرضوں پر اسکا اطلاق نہیں ہوگا۔ زرعی تجارتی درآمدات اور برآمدات پر جاری ہونے والے قرضوں کی متعدد قسموں پر اس کا اطلاق ممکن نہیں۔ لہٰذا اسے درست اور جائز مان بھی لیا جائے تو بھی یہ بنکاری کے نقطہ نظر سے موثر متبادل اساس نہیں بن سکتی۔ خود وفاقی شرعی عدالت نے بھی اجارہ ر پٹہ داری کے بارے میں لکھا ہے کہ اگرچہ پٹہ داری شریعت میں جائز ہے پھر بھی ہم بنکاری نظام میں اسکے کم سے کم استعمال کا مشورہ دیں گے۔

ملکیتی کرایہ داری۔ بیع بالا جارہ

یہ ذریعہ تمویل بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا تھا۔ وفاقی شرعی عدالت نے فقہ کی مستند کتب میں درج کی گئی شرائط کی تکمیل کے ساتھ اسے جائز قرار دیا ہے۔ پٹہ داری کے تحت بیان کئے گئے خیالات کے علاوہ ہماری دانست میں درج ذیل امور بھی توجہ کے مستحق ہیں۔

(۱)۔کرایہ کا تعین اثاثہ کی اصل قیمت کے حوالے سے کیا جائے گا تاہم جوں جوں یہ اثاثہ پرانا ہوتا جائے اس پر کرایہ بھی کم ہو جانا چاہئے۔

(۲)۔ اس اثاثہ پر انشورنس کے اخراجات فریقین کو اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے برداشت کرنے ہونگے۔

(۳)۔ معمول کی مرمت کے اخراجات فریقین کو برابری کی بنیاد پر برداشت کرنے چاہئیں۔

(۴)۔ جوں جوں خریدار اقساط کی ادائیگی کے ذریعے اثاثے میں اپنا سرمایہ بڑھاتا جائے اسی مناسبت سے بنک کے کرایہ وصول کرنے کے استحقاق میں کمی واقع ہونی چاہئے۔ ملکیتی کرایہ داری میں ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے اس ذریعہ تمویل کی صورتحال مزید مشتبہ ہو جاتی ہے۔ فنی اعتبار سے اس ذریعہ تمویل کا صرف مکان کی تعمیر یا سواری کی خرید کیلئے فراہم کئے جانے والے قرضوں پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور دیگر بیسیوں قسم کے قرضے اس ذریعہ تمویل سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔

سروس چارجز

یہ تجویز بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں پیش کی تھی۔ وفاقی شرعی عدالت نے اسے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ حق الخدمت حقیقی اخراجات تک محدود ہو جو کہ عملاً ممکن نہیں۔ شاید اسی وجہ سے خود علامہ موصوف نے بھی اسکے زیادہ استعمال کو بنک کے حق میں بہتر قرار نہیں دیا۔ اس ضمن میں ہماری آراء بھی پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ مختصراً ہماری رائے ہے کہ یہ ذریعہ اپنے اندر اسقدر پیچیدگی اور مسائل سمیٹے ہوئے ہے کہ اسے سرے سے نظام بنکاری میں جگہ ہی نہیں دی جا سکتی۔ (اس مسئلہ پر راقم اپنے خیالات تفصیلاً الگ قلمبند کر چکا ہے)۔

عمومی شرح منافع پر سرمایہ کاری

یہ تجویز بنیادی طور پر اسلامی نظریاتی کونسل نے دی تھی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ سے ایک عمومی تاثر یہ ملتا ہے کہ جیسے ہی اس کے سامنے کوئی ایسا ذریعہ تمویل آیا جسکے استعمال سے مقروض فرموں کے کھاتے دیکھنے کی ذمہ داری سے جان چھوٹتی ہو' وہ فوراً اسے قبول کرنے کی طرف مائل ہو گی۔ اسی متذکرہ خوبی کی بناء پر کونسل نے اسے پسند کیا لیکن اس قوی خدشے کا اظہار خود کر دیا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عملاً یہ سود ہی کی ایک شکل بن جائے گی۔ اس لئے اس ذریعہ کا استعمال انتہائی ناگزیر حالات میں محدود پیمانے پر کیا جائے۔ اس ذریعہ تمویل کے حوالے سے یہ تردد اور تامل تو ہے اسکے اصل تجویز کنندگان کا' لیکن علامہ موصوف جنہوں نے محض ایک ناقل کے فرائض سرانجام دئے ہیں' پورے اعتماد کے ساتھ اسے قابل عمل ذریعہ تمویل قرار دے رہے ہیں جبکہ ہماری دانست میں یہ ذریعہ تمویل بھی ناقابل عمل اور مشتبہ ہے۔

بذریعہ نیلام

یہ تجویز بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں درج ہے اور ہماری دانست میں یہ انتہائی رسوا کن حیلہ ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ سرمائے کو ہی نیلام کرنا شروع کر دیں جبکہ واپسی بذریعہ اقساط مقرر کر لی جائے۔ بولی لگانے والا خواہ اس سرمائے سے مشینری لگائے یا عیش اڑائے' بنک بذریعہ اقساط اپنی رقم واپس لیتا رہے۔ اگر ذرا بھی غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نیلام کیا کر رہے ہیں۔ یہ بلڈنگ نہ مشین نہ کارکن' کچھ بھی موجود نہیں بلکہ صرف ایک کاغذی سکیم کو نیلام کیا جارہا ہے جبکہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو چیز تمہارے پاس موجود ہی نہیں' وہ فروخت نہیں کی جا سکتی شریعت کے تصور کردہ بیع کے اصولوں میں سے اہم ترین اصول یہ ہے کہ مال اور قیمت دونوں میں سے ایک کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں نہ بکنے والی شے موجود ہے اور نہ ہی خریدنے والی رقم' لہٰذا یہ فروخت سرے سے ناجائز ہے۔ ویسے بھی ایسی تجاویز پیش کر کے ہم اپنے فکری دیوالیہ پن کا ثبوت تو فراہم کر سکتے ہیں اسلام کی خدمت نہیں۔

موصوف کے پیش کردہ خاکے پر اپنے تجزیہ کو یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس خاکے میں کوئی نئی ٹھوس مثبت اور قابل عمل تجویز پیش نہیں کی بلکہ محض ایک ناقل کی حیثیت سے اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں دی گئی تجاویز کو من وعن نقل کر دیا ہے۔ انکا پیش کردہ نظام قابل عمل ہے یا نہیں' اس سے قطع نظر پہلے تو انہیں یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ یہ نظام ان کا تیار کردہ نہیں بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل کا تجویز کردہ ہے جسے وہ تائیداً" بیان کر رہے ہیں۔ یہی اعلیٰ ظرفی ہوتی ہے اور یہی علمی دیانت کا تقاضہ

ہم نہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں سود کا متبادل نظام نہیں ہے اور نہ ہی متبادل نظام کی تیاری کے حوالے سے ناامید ہیں۔ لیکن موصوف کی طرف سے اس قدر طمطراق کے ساتھ جعلوں کے پلندے کی صورت میں کھوکھلا اور بے وقعت نظام سامنے آنے کے بعد اتنی درخواست ضرور کریں گے کہ علمائے کرام اس سنجیدہ علمی مسئلے کو نہ تو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کریں اور نہ ہی اسے سود پر دنگل کی شکل دیں بلکہ اگر ہو سکے تو اپنی توانائیاں کھپا کر اس کا ٹھوس حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہی قومی خدمت ہے اور یہی دین کے ساتھ حقیقی وفاداری' ورنہ اس طرح کی لا حاصل کوشش تو مسلمانوں کو مزید مضطرب اور مایوس ہی کرے گی۔○○

"ہمارے ذمے ہے رزق تمہارا اور ان کا بھی"

محمد اقبال اعوان

موجودہ حکمران برسر اقتدار آنے سے قبل اسلام کی سربلندی اور شریعت کے نفوذ کے ارادے کا اظہار اس طرح کرتے تھے جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی یہی ہو لیکن عنان حکومت سنبھالنے کے فوری بعد انہوں نے خلاف اسلام کارروائیاں شروع کردیں اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قابل ذکر و ناقابل ذکر عمائدین حکومت نے مختلف حیلے بہانوں سے اسلامی قوانین کے خلاف بیان بازی کرنا شروع کردی اور شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ ایک وزیر مملکت نے سود کی حمائت میں ایک منظم مہم چلا کر عذاب الٰہی کو دعوت دی۔ قرآن مجید میں تو صاف خبردار کیا گیا ہے کہ سودی کاروبار کروگے تو جان لو کہ تم خدا اور رسول سے جنگ کرنے کی لئے تیار ہو۔

شریعت بل اسمبلیوں سے پاس کروا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت نے ملک میں اسلامی قانون نافذ کر دیا ہے لیکن دینی حلقے بخوبی جانتے ہیں کہ اس بل میں باقی تو سب کچھ ہے' نہیں تو شریعت ہی نہیں حالانکہ اگر خلوص دل سے اور صحیح معنوں میں اس کا نفاذ ہوتا تو اس کے ثمرات وبرکات سے پوری قوم فیض یاب ہوتی۔ مگر ان لوگوں کو بخوبی علم تھا کہ نفاذ شریعت سے ان کے الٹے تلے ختم ہو جاتے تھے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔" اور پھر اللہ تعالیٰ یہ نوید دیتے ہیں کہ اگر تم مخلص مومن بن جاؤ اور اللہ کے احکامات کے مطابق اپنی پوری زندگی ڈھال لو تو پھر تم ہی سربلند ہوگے اور کوئی دوسرا تم پر غالب نہیں آسکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے باوجود ہم نے بحیثیت قوم اللہ کے ہر حکم کو پس پشت ڈالنا اپنا وطیرہ بنا لیا ہے حالانکہ اللہ بزرگ وبرتر کا وعدہ ہرگز جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا میں سرخروئی' عزت' شان و شوکت کا راستہ ہے اور آخرت میں بھی نجات' کامیابی اور فلاح کا۔

ابھی حال ہی میں مملکت خداداد پاکستان کے ایک اور وزیر مملکت نے ایک تازہ بیان دے کر اللہ کے غضب کو للکارنے کی کوشش کی ہے۔ ہر ذی روح کو رزق دینا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔ ان کی پرورش اور ان کے رزق کے خوف سے سرکاری ملازمین کے بچوں کی تعداد پر قدغن لگانا صریحا ظلم اور اللہ کے ساتھ بغاوت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ اپنی اولادوں کو افلاس کے سبب قتل نہ کرو کیونکہ ہم ان کو' اور تم سب کو رزق دیں گے' وہ تمہارے رزق مقرر میں شریک نہیں ہیں۔ پھر کیوں قتل کرتے ہو جب کہ قتل کرنا حرام ہے"

اس میں قتل اولاد کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اور اصل رازق جب خود خدا ہی ہے تو کسی دوسرے کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری جان کو اس لئے قتل کردے کہ وہ کھانے کو مانگے گی۔ مذکورہ وزیر صاحب کا بیان اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اس ملک میں فیملی پلاننگ کی سرکاری سطح پر تشہیر نہ صرف دین کی خلاف ورزی ہے بلکہ غیر ملکی آقاؤں خصوصا یہودیوں کو خوش کرنے کی ایک کوشش بھی ہے۔

اسلام کے بنیادی حقوق کی رو سے ہر انسان کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی نجی زندگی محفوظ رہے۔ کیا ہم ان فرسودہ مغربی تصورات کو قبول کر کے اس بات کا اعادہ تو نہیں کر رہے کہ دین کے بارے میں ہم احساس کمتری کا شکار ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اسلامی قوانین کی حقانیت دنیا تسلیم کر چکی ہے اور اسلام نے انسانی فلاح و بہبود کا جو تصور دیا ہے' وہ کسی اور نظام میں موجود نہیں۔

ماہنامہ میثاق لاہور

کی اشاعتِ خصوصی۔ بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء

مضامین کی جھلک

- جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران
- پس منظر ● تجزیہ ● تبصرہ ——— اور ● مشورے
- اسلام اور پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش
- اس میں مذہبی جماعتوں کا کردار اور اس کا متوقع نتیجہ!
- مولانا مودودی مرحوم اور میں

تمام تحریریں ازقلم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی

● صفحات ۱۲۸ ● اس شمارے کی قیمت ۱۰/- (سالانہ زرتعاون ۵۰/-)

منگوانے کے پتے (i) مرکز تنظیم اسلامی، ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور (ii) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور